

مَدِينَةُ الْمَدِينَةِ وَالْمَدِينَةِ الْمَدِينَةِ

مَدِينَةُ الْمَدِينَةِ

شماره
16

صفر ۱۴۳۱ھ، فروری ۲۰۱۰ء

مدیر

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

اللہ کہاں ہے؟

خلیفہ بلا فصل کون؟

نماز میں سلام کا جواب!

سند دین ہے!

امام کی نماز فاسد ہونے سے مقتدی کی نماز فاسد نہیں

صحیح بخاری کا مطالعہ اور فقہ انکار حدیث

رَبِّ الْمُتَّقِينَ وَالْمُتَّقِينَ، جہلم، پاکستان

www.AhleSunnatPk.com

اللہ کہاں ہے؟



ائمہ اہل سنت محدثین مؤمنین کا یہ اجماعی اور اتفاقی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں کے اوپر اپنے عرش پر بلند ہے اور مخلوق سے جدا ہے۔

① جیسا کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ (م ۷۴۸) لکھتے ہیں:

وهو قول أهل السنة قاطبة أنّ كَيْفِيَّةَ الاستواء لا نعقلها ، بل نجهلها ، وأنّ الاستواء معلوم ، كما أخبر في كتابه ، وأنّه كما يليق به ، لا نتعمّق ، ولا نتحدّق ، ولا نخوض في لوازم ذلك نفيا ولا اثباتا ، بل نسكت ونقف كما وقف السلف ، ونعلم أنّه لو كان له تأويل لبادر الى بيانه الصحابة والتابعون ، ولما وسعهم اقراره وامراره والسكوت عنه ، ونعلم يقينا مع ذلك أنّ الله جلّ جلاله لا مثل له في صفاته ولا في استوائه ولا في نزوله ، سبحانه وتعالى عمّا يقول الظالمون علواً كبيراً ”تمام اہل سنت کا یہی مذہب ہے کہ صفتِ استواء (اللہ تعالیٰ کے عرش پر بلند ہونے) کی کیفیت کو ہم سمجھ نہیں سکتے ، بلکہ ہم اس سے لاعلم ہیں ، صفتِ استواء تو معلوم ہے ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں خبر دے دی ہے ، وہ اس کے شایانِ شان ہے ، ہم اس بارے میں گہرائی میں نہیں جاتے ، نہ اپنی طرف سے باتیں بناتے ہیں اور نہ ہی اس کے لوازم میں نفی یا اثبات کے اعتبار سے غوطہ زن ہوتے ہیں ، بلکہ ہم خاموش ہو جاتے ہیں اور اسی طرح رُک جاتے ہیں ، جس طرح سلف صالحین رُک گئے تھے ۔ ہم جانتے ہیں کہ اگر اس صفت کی کوئی تاویل (صحیح) ہوتی تو صحابہ و تابعین اس کو بیان کرنے میں سبقت لے جاتے ، نیز ان کو اس صفت کے اقرار ، اس کو حقیقت پر جاری رکھنے اور اس پر خاموشی اختیار کرنے کی گنجائش نہ ہوتی ۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم یقینی طور پر یہ بھی جانتے ہیں کہ صفاتِ استواء ، نزول وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مثل نہیں ، ظالم لوگ جو کچھ کہتے ہیں ، اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس سے بہت بلند ہے۔“ (العلو للذہبی : ص ۱۰۴)

نیز لکھتے ہیں: وقول عموم أمة محمد صلى الله عليه وسلم : ان الله في السماء ، يطلقون ذلك وفق ما جاءت النصوص باطلاقه ، ولا يخوضون في تأويلات المتكلمين مع جزم الكل بأنه تعالى ليس كمثله شيء ...

”تمام امت محمدیہ علیہ السلام کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر ہے، وہ اس بات کو مطلق ہی رکھتے ہیں، جیسا کہ (قرآن و سنت کی) نصوص اس بارے میں مطلق ہی آئی ہیں۔ وہ متکلمین کی تاویلات میں نہیں پڑتے۔ اس کے ساتھ ساتھ سب اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں۔“ (سیر اعلام النبلاء للذهبی: ۷۱-۷۰/۱)

② شیخ الاسلام، المجاہد، القدوہ، الامام، عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ (م ۱۸۱ھ) کے بارے میں امام، حافظ، ثقہ، علی بن الحسن بن شقیق رحمہ اللہ (م ۲۱۵ھ) بیان کرتے ہیں:

سألت عبد الله بن المبارك : كيف ينبغي لنا أن نعرف ربنا عز وجل ؟ قال : على السماء السابعة على عرشه ، بائن من خلقه ، ولا نقول كما تقول الجهمية : انه هاهنا في الأرض . ”میں نے امام عبداللہ بن المبارک سے سوال کیا، ہمیں اپنے رب عزوجل کو کس طرح پہچاننا چاہیے؟ آپ رحمہ اللہ نے فرمایا، (اللہ تعالیٰ) ساتویں آسمان کے اوپر اپنے عرش پر ہے، اپنی مخلوق سے جدا ہے، ہم جمیوں کے طرح یہ نہیں کہتے کہ وہ یہاں زمین میں ہے۔“ (السنة لعبد الله بن احمد: ۱۱۷/۱، ح: ۱۷۵-۱۷۴/۱، ح: ۲۱۶، الرد على المريسي للدارمي: ص ۱۰۳، الرد على الجهمية للدارمي: ص ۵۰، الاسماء والصفات للبيهقي: ۹۰۳، وسنده صحيح)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس قول کے بارے میں فرماتے ہیں: هذا صحيح ثابت .

”یہ قول صحیح اور ثابت ہے۔“ (العرش للذهبی: ۲۴۰/۲)

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وروى عبد الله بن الامام أحمد وغيره بأسانيد صحيحة عن ابن المبارك . ”(اس قول کو) امام احمد کے بیٹے عبداللہ وغیرہ نے

صحیح سند کے ساتھ امام عبداللہ بن المبارک سے نقل کیا ہے۔“ (الفتاوى الحموية لابن تيمية: ص ۹۱)

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وقد صح عنه صحة قريبة من التواتر .

”یہ قول آپ (امام عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ) سے اس قدر صحیح ثابت ہے کہ متواتر کے قریب پہنچ

گیا ہے۔“ (اجتماع الجیوش الاسلامیہ لابن القيم: ۲۱۳-۳۱۴)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ یہ قول ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: قلت: الجہمیۃ یقولون: انّ الباری تعالیٰ فی کلّ مکان، والسلف یقولون: انّ علم الباری فی کلّ مکان، ویحتجّون بقوله تعالیٰ: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ﴾ (الحديد: ۴/۵۷)، یعنی بالعلم، ویقولون: انّہ علی عرشہ استوی، كما نطق به القرآن والسنة.

ومعلوم عند أهل العلم من الطوائف أنّ مذهب السلف امرار آیات الصفات وأحاديثها كما جاءت من غير تأویل ولا تحریف ولا تشبیہ ولا تکلیف، فانّ الکلام فی الصفات فرع علی الکلام فی الذات المقدسة، وقد علم المسلمون أنّ ذات الباری موجودة حقيقة، لا مثل لها، وكذلك صفاته تعالیٰ موجودة، لا مثل لها.

”جہمی لوگ یہ کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ ہر جگہ میں ہے، جبکہ سلف صالحین کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ کا علم ہر جگہ میں ہے، وہ اس فرمان باری تعالیٰ سے دلیل لیتے ہیں: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ﴾ (الحديد: ۴/۵۷) (وہ اللہ تمہارے ساتھ ہے، جہاں بھی تم ہو) کہ یہاں علم مراد ہے، اللہ تعالیٰ تو اپنے عرش پر مستوی ہے، جیسا کہ قرآن و سنت نے بتا دیا ہے۔

اہل علم کو یہ معلوم ہے کہ سلف صالحین کا مذہب یہ ہے کہ صفات باری تعالیٰ پر مشتمل آیات واحادیث کو اسی طرح حقیقت پر رکھا جائے گا، جس طرح کہ وہ آئی ہیں، کوئی تاویل، تحریف، تشبیہ اور تکلیف نہیں کی جائے گی، کیونکہ صفات باری تعالیٰ کے بارے میں کلام ذات باری تعالیٰ کے بارے میں کلام کی فرع ہے۔ مسلمان یہ یقین رکھتے ہیں کہ باری تعالیٰ کی ذات حقیقتاً موجود ہے، اس کی کوئی مثل نہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات بھی موجود ہیں اور ان کی بھی کوئی مثل نہیں۔“

(سیر اعلام النبلاء للذہبی: ۴۰۲/۸)

③ امام ابو زرعہ الرازی رحمہ اللہ (م ۲۶۳ھ) اور امام ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ (م

۲۷۷ھ) سے اہل سنت کے مذہب کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:

أدر كننا العلماء في جميع الأمصار ، حجازاً ، وعراقاً ، ومصر ، وشاماً ، ويمناً ،
وكان من مذهبهم أنّ الله على عرشه بائن من خلقه ، كما وصف نفسه بلا كيف ،
أحاط بكل شيء علماً ... ”ہم نے حجاز و عراق ، مصر و شام اور یمن تمام علاقوں کے علمائے کرام کو
دیکھا ہے، (عقیدے میں) ان سب کا مذہب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر (بلند) اور اپنی مخلوق سے جدا
ہے، جس طرح کہ اس نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کی زبان کے ذریعے بغیر کیفیت بیان کیے بتایا ہے،
اس نے ہر چیز کا علم کے ذریعے احاطہ کر رکھا ہے۔“ (کتاب اصل السنة واعتقاد الدين لابن ابي حاتم)

④ امام عثمان بن سعید الدارمی رحمہ اللہ (م ۲۸۰ھ) لکھتے ہیں: وقد اتفقت
الكلمة من المسلمين أنّ الله فوق عرشه ، فوق سماواته . ”یہ مسلمانوں کا اتفاق مذہب
ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر آسمانوں کے اوپر ہے۔“ (الرد علی بشر المریسی للدارمی : ص ۴۰۸)
اس قول کو ذکر کرنے کے بعد حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قلت : أوضح شيء في هذا الباب قوله تعالى: ﴿الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ
اسْتَوَى﴾ (طہ: ۵/۲۰)، فليمرّ كما جاء ، كما هو معلوم من مذهب السلف ، وينهى
الشخص عن المراقبة والجدال ، وتأويلات المعتزلة: ﴿رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنزَلْتَ
وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ﴾ (آل عمران: ۵۳/۳). ”میں کہتا ہوں کہ اس بارے میں سب سے
واضح ترین نص یہ فرمان باری تعالیٰ ہے کہ: ﴿الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى﴾ (طہ: ۵/۲۰) (رحمن
عرش پر مستوی ہے)، یہ آیت جس طرح آئی ہے، اسی طرح اس کو رکھا جائے، جیسا کہ سلف صالحین کا
مذہب معلوم ہے، نیز آدمی کو ، جدال اور معتزلہ کی تاویلات سے یہ فرمان الہی روکتا ہے: ﴿رَبَّنَا
آمَنَّا بِمَا أَنزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ﴾ (آل عمران: ۵۳/۳)۔“

(سير اعلام النبلاء للذهبي: ۳۲۵/۱۳)

⑤ امام ابوالحسن الاشعری رحمہ اللہ (م ۳۲۴ھ) کے بارے میں حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے

ہیں: وكذلك أبو الحسن الأشعري نقل الاجماع على أنّ الله استوى على عرشه.
 ”اسی طرح امام ابو الحسن الاشعری نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر
 مستوی ہے۔“ (مختصر الصواعق المرسلّة لابن القيم: ۳۱۸)
 تفصیل کے لیے امام ابو الحسن الاشعری رحمہ اللہ کی کتاب الابانة اور مقالات الاسلامیین
 کا مطالعہ کریں۔

⑥ امام ابوبکر الآجری رحمہ اللہ (م ۳۶۰ھ) فرماتے ہیں:

فاننى أحذر اخوانى المؤمنين مذهب الحلوليّة ، الذى لعب بهم الشيطان ،
 فخرجوا بسوء مذهبهم عن طريق أهل العلم الى مذاهب قبيحة ، لا تكون الا فى
 مفتون هالك . زعموا أنّ الله عزّوجلّ حالّ فى كلّ شيء ، حتّى أخرجهم سوء
 مذهبهم الى أن تكلموا فى الله عزّوجلّ بما تنكره العلماء العقلاء ، لا يوافق قولهم
 كتاب ولا سنّة ولا قول الصحابة رضى الله عنهم ولا قول أئمة المسلمين ...
 ”میں اپنے مؤمن بھائیوں کو حلولیہ کے مذہب سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں، جن کے ساتھ شیطان
 نے کھیل کھیلا اور وہ اپنے برے مذہب کی وجہ سے اہل علم کے مذہب سے نکل کر ایسے قبیح مذہب کی
 طرف نکل گئے، جن کو کوئی پاگل و مجنون شخص ہی اپنا سکتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز میں
 حلول کیے ہوئے ہے، یہاں تک کہ ان کے مذہب کی گندگی نے ان کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی
 ایسی باتیں کرنے پر مجبور کیا، جن کا عقل مند علمائے کرام انکار کرتے ہیں۔ نہ تو کتاب و سنت میں ان
 کے قول کی حمایت موجود ہے، نہ ہی صحابہ کرام اور ائمہ مسلمین کا کوئی قول ان کے موافق ہے۔“

(الشریعة للآجری: ۲۷۳/۱)

④ الامام، المقرئ، المحقق، المحدث، الحافظ، الاثری، ابو عمر احمد بن محمد الطمنی رحمہ اللہ
 (م ۴۲۹ھ) اپنی کتاب ”الوصول الى معرفة الاصول“ میں لکھتے ہیں:
 أجمع

المسلمون من أهل السنّة على أنّه معنى قوله : ﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ ﴾ (الحديد:

(۴/۵۷) ، ونحو ذلك من القرآن أنه علمه ، وأن الله تعالى فوق السماوات بالذات مستو على عرشه كيف شاء . ”اہل سنت مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ فرمان باری تعالیٰ ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ﴾ (الحديد: ۴/۵۷) (وہ اللہ تمہارے ساتھ ہے، جہاں بھی تم ہو) اور اس طرح کی دوسری قرآنی آیات کا معنی ہے کہ وہ اس کا علم ہے، اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر اپنے عرش پر اپنی ذات کے ساتھ مستوی ہے، جیسے اس کی شان کے لائق ہے۔“ (العلو للذهبی: ص ۱۷۸)

⑧ الامام، الحافظ، شیخ السنۃ، ابو نصر عبد اللہ بن سعید الوائلی الجری رضی اللہ عنہ (م ۴۳۴ھ) اپنی کتاب الابائۃ میں لکھتے ہیں: وأئمتنا كسفیان ، ومالك ، والحمادین ، وابن عیینة ، والفضیل (ابن عیاض) ، وابن المبارک ، وأحمد بن حنبل ، واسحاق متفقون علی أن الله سبحانه فوق العرش وعلمه بكل مكان ، وأنه ينزل الى السماء الدنيا ، وأنه يغضب ويرضى ويتكلم بما شاء . ”ہمارے ائمہ، مثلاً سفیان (ثوری)، مالک، دونوں حماد (حماد بن سلمہ، حماد بن زید)، (سفیان) ابن عیینہ، فضیل (ابن عیاض)، (عبد اللہ) ابن المبارک، احمد بن حنبل اور اسحاق رضی اللہ عنہم اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ عرش پر ہے اور اس کا علم ہر جگہ میں ہے، وہ (رات کو) آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے، وہ غصے میں آتا، راضی ہوتا اور جو چاہے کلام کرتا ہے۔“ (سیر اعلام النبلاء للذهبی: ۶۵۶/۱۷، مجموع الفتاوی لابن تیمیہ: ۱۹۰/۵)

⑨ الامام ابو عثمان اسماعیل بن عبد الرحمن الصابونی رضی اللہ عنہ (۳۷۳-۴۲۹ھ) فرماتے ہیں: وعلماء الأئمة وأعيان الأئمة من السلف رحمهم الله لم يختلفوا في أن الله تعالى على عرشه ، وعرشه فوق سماواته ، يثبتون له من ذلك ما أثبتته الله تعالى ويؤمنون به ويصدقون الرب جل جلاله في خبره ، ويطلقون ما أطلقه سبحانه وتعالى من استوائه على العرش ، ويمرونه على ظاهره ، ويكلون علمه الى الله .

”امت کے علماء اور سلف میں سے بڑے بڑے ائمہ اس بات پر متفق تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر مستوی ہے، اس کا عرش اس کے آسمانوں کے اوپر ہے، وہ (سلف صالحین) اللہ تعالیٰ کے لیے وہ

صفات ثابت کرتے ہیں، جو خود اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے ثابت کی ہیں اور وہ اس کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اور اپنے رب تعالیٰ کی خبر میں اس کی تصدیق کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے مطلق چھوڑا ہے، اس کو وہ مطلق چھوڑتے ہیں، یعنی عرش پر مستوی ہونا، وہ (سلف) اس کو اس کے ظاہر پر برقرار رکھتے ہیں اور اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔“ (عقیدۃ السلف أصحاب الحدیث: ص ۱۵-۱۶)

⑩ الامام، حافظ المغرب ابو عمر ابن عبد البر رحمہ اللہ (م ۴۶۳ھ) نزول باری تعالیٰ کے متعلق حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: وفيه دليل على أن الله عز وجل في السماء على العرش من فوق سبع سماوات، كما قالت الجماعة، وهو من حجتهم على المعتزلة والجهمية في قولهم: ان الله عز وجل في كل مكان، وليس على العرش. ”اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں کے اوپر عرش پر مستوی ہے، جیسا کہ اہل سنت والجماعت نے کہا ہے، یہ حدیث معتزلہ اور جہمیہ کے اس قول کے خلاف ان کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ ہے، عرش پر نہیں۔“ (التمهيد لابن عبد البر: ۱۲۹/۷)

⑪ عالم ربانی، شیخ الاسلام ثانی، علامہ ابن القیم الجوزیہ رحمہ اللہ (۶۹۱-۷۵۱ھ) لکھتے ہیں: أجمع المسلمون من الصحابة والتابعين أن الله على عرشه فوق سماواته، بائن عن خلقه. ”صحابہ و تابعین، یعنی مسلمانوں نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر آسمانوں کے اوپر ہے، اپنی مخلوق سے جدا ہے۔“ (مختصر الصواعق المرسله: ۴۸)

⑫ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (۷۷۳-۸۵۲ھ) ائمہ اہل سنت کے اللہ تعالیٰ کے عرش پر ہونے کے متعلق اقوال ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: فكيف لا يوثق بما اتفق عليه أهل القرون الثلاثة، وهم خير القرون بشهادة صاحب الشريعة. ”اس بات پر کیسے اعتماد نہ کیا جائے، جس پر تینوں زمانوں والوں (صحابہ، تابعین، تبع تابعین) نے اتفاق کیا ہے، یہ زمانے سب زمانوں سے بہتر ہیں کہ اس کی گواہی خود صاحب شریعت (رسول اللہ ﷺ) نے دی ہے۔“ (فتح الباری فی شرح صحیح البخاری لابن حجر: ۴۰۷/۳-۴۰۸)

خليفة بلا فصل کون؟

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت و امامت پر اجماع کے بعد قرآن و حدیث کے دلائل پیش خدمت ہیں: اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا...﴾ (النور: ۵۵/۲۴)

”اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو ضرور زمین میں خلافت عطا کرے گا، جیسا کہ اس نے ان لوگوں کو خلافت عطا کی تھی، جو ان سے پہلے تھے اور وہ ان کے لیے ضرور ان کے اس دین کو طاقت دے گا، جس کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور وہ ضرور ان کے خوف کے بعد امن لائے گا، وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔۔۔“

امام عبدالرحمن بن عبدالحمید المہدی رحمہ اللہ (م ۱۹۲ھ) فرماتے ہیں: أرى ولاية أبي بكر وعمر رضي الله عنهما في كتاب الله عز وجل، يقول الله: ﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ...﴾ (النور: ۵۵/۲۴)

”میں سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کو قرآن کریم میں دیکھ رہا ہوں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ...﴾ (النور: ۵۵/۲۴) اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے

کہ وہ ان کو ضرور زمین میں خلافت عطا کرے گا۔“ (تفسیر ابن ابی حاتم: ۹۱۷/۱۰ وسندہ صحیح)

امام آجری رحمہ اللہ (م ۳۶۰ھ) لکھتے ہیں: ”اللہ تعالیٰ ہم پر آپ پر رحم کرے!“

جان لو کہ سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر، سیدنا عثمان، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا بیان اللہ تعالیٰ کی کتاب، سنت رسول، اقوال صحابہ اور اقوال تابعین میں موجود ہے، کوئی مسلمان، جسے اللہ تعالیٰ نے عقل دی ہے، اس میں شک نہیں کر سکتا۔ قرآنی دلیل تو فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا...﴾ (النور: ۵۵/۲۴) (اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو ضرور زمین میں خلافت عطا کرے گا، جیسا کہ اس نے ان لوگوں کو خلافت عطا کی تھی، جو ان سے پہلے تھے اور وہ ان کے لیے ضرور ان کے اس دین کو طاقت دے گا، جس کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور وہ ضرور ان کے خوف کے بعد امن لائے گا، وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔۔۔)، اللہ تعالیٰ کی قسم ہے! اللہ تعالیٰ نے ان سے کیا ہوا اپنا یہ وعدہ پورا فرمایا اور ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کو خلافت اور علاقوں میں حکومت دی، انہوں نے فتوحات کیں، اموال کو غنیمت میں حاصل کیا، کافروں کے بچوں اور بیویوں کو قید کیا، ان کی خلافت میں بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے تھے، جو لوگ اسلام سے مرتد ہو گئے تھے، ان سے لڑائی کی، حتیٰ کہ ان کو جلاوطن کر دیا، ان میں سے بعض نے رجوع کر لیا۔ اسی طرح سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا، ان کی مرتدین کے خلاف تلوار تاقیامت برحق ہے، اسی طرح خلیفہ رابع سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے، ان کی خارجیوں کے خلاف لڑائی تاقیامت برحق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خلافت کی وجہ سے اپنے دین کو عزت دی، دشمنوں کو ذلیل کیا اور مشرکین کے ناپسند کرنے کے باوجود اللہ کا امر غالب ہوا۔ خلفائے راشدین نے مسلمانوں کے لیے معزز طریقے چھوڑے، وہ اہل سنت والجماعت پر مشتمل تمام امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر برکت تھے۔‘ (الشريعة للأجری: ۵۶۴-۵۶۵)

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ (م ۴۵۸ھ) کہتے ہیں: وقد دلّ کتاب اللہ عزّوجلّ علی امامة أبی بکر ومن بعده من الخلفاء، قال اللہ عزّوجلّ: ﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ

وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لِيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتُخْلِفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ... ﴿النور: ٥٥/٢٤﴾

”سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد آنے والے خلفائے راشدین کی امامت پر قرآن کریم کی دلیل موجود ہے، فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتُخْلِفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ...﴾ (النور: ٥٥/٢٤) (اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو ضرور زمین میں خلافت عطا کرے گا، جیسا کہ اس نے ان لوگوں کو خلافت عطا کی تھی، جو ان سے پہلے تھے اور وہ ان کے لیے ضرور ان کے اس دین کو طاقت دے گا، جس کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے۔۔۔)“ (الاعتقاد للبيهقي: ٤٨٣)

دلیل نمبر ①: قال الامام أبو داود (الطيالسي): حَدَّثَنَا الْحَشْرَجُ بْنُ نَبَاتَةَ، قَالَ: حَدَّثَنِي سَعِيدُ بْنُ جَهْمَانَ، قَالَ: حَدَّثَنِي سَفِينَةُ، قَالَ: خَطَبَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: الْخِلَافَةُ فِي أُمَّتِي ثَلَاثُونَ سَنَةً، ثُمَّ يَكُونُ مَلِكٌ، ثُمَّ قَالَ: سَفِينَةُ: أَمْسَكَ خِلَافَةَ أَبِي بَكْرٍ وَخِلَافَةَ عُمَرَ ثِنْتَا عَشْرَةَ سَنَةً وَسِتَّةَ أَشْهُرٍ، وَخِلَافَةَ عُثْمَانَ ثِنْتَا عَشْرَةَ سَنَةً، ثُمَّ خِلَافَةُ عَلِيٍّ تَكْمِلَةُ الثَّلَاثِينَ، قُلْتُ: فَمَعَاوِيَةُ؟ قَالَ: كَانَ أَوَّلَ الْمُلُوكِ. ”سَفِينَةُ رَضِيَ اللہُ عَنْہُ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا، میری امت میں خلافت تیس سال ہوگی، پھر بادشاہت ہوگی، سَفِينَةُ نے کہا، تو شمار کر لے، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت بارہ سال اور چھ ماہ تھی، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت بارہ سال تھی، پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت نے تیس سال پورے کر دیئے، (سَعِيدُ بْنُ جَهْمَانَ کہتے ہیں) میں نے کہا، پھر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ (کا کیا معاملہ تھا)؟، فرمایا، وہ پہلے بادشاہ تھے۔“ (مسند الطيالسي: ص ١٥١، ح: ١٢٠٣، مسند الامام احمد: ٥/٢٢٧، سنن الترمذی: ٢٢٢٦، وسنده حسن)

الحشرج بن نباتة کی متابعت سنن ابی داؤد (٤٢٤٦) وغیرہ میں عبد الوارث بن سعید البصری (ثقة

ثبت) نے اور مسند احمد (۲۲۱-۲۲۰/۵) وغیرہ میں حماد بن سلمہ (ثقة ثبت) اور سنن ابی داؤد (۴۶۷) میں العوام بن حوشب الواسطی نے کر رکھی ہے۔

رہا مسئلہ سعید بن جہان کا تو جمہور نے اس کو ”توثیق“ کی ہے۔

اس کو ① امام احمد بن حنبل (السنة للخلال: ص ۴۱۹)، ② امام یحییٰ بن معین (تاریخ یحییٰ بن معین: ۳۶۹۵)، ③ امام ابن عدی (الکامل: ۴۰۲/۳، قال: أرجوا أنه لا بأس به)، ④ امام یعقوب بن سفیان (المعرفة والتاريخ: ۷۸/۲)، ⑤ امام ترمذی (السنن: ۲۲۲۶ بتحسین حدیثہ)، ⑥ امام ابن ابی عاصم (السنة: ۱۲۲۲ بتصحیح حدیثہ)، ⑦ امام ابن الجارود (المنتقى: ۹۷۶ بتصحیح حدیثہ)، ⑧ امام ابن حبان (الثقات: ۲۷۸/۴)، ⑨ امام حاکم (المستدرک: ۷/۳ بتصحیح سندہ) اور ⑩ حافظ یشی (مجمع الزوائد: ۳۶۶/۹) رحمہم اللہ وغیرہم نے ”ثقة“ کہا ہے۔

کسی ثقة امام نے ان کو ”ضعیف“ نہیں کہا۔ مدعی پر دلیل لازم ہے!

رہا امام بخاری رحمہ اللہ (التاريخ الصغير: ۱۹۶/۱) اور حافظ ساجی (تهذيب التهذيب: ۱۴/۴) کا یہ کہنا کہ لا يتابع على حدیثہ۔ کہنا تو یہ مضرب نہیں، کیونکہ جب یہ واضح ثقة ہیں تو ان کی متابعت نہ ہونے میں کوئی حرج نہیں، اسی لیے حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس راوی کو اپنی کتاب من تکلم فیہ وهو موثق أو صالح الحدیث (۱۲۷) میں ذکر کیا ہے، لہذا حافظ ذہبی کا قوم بضعفون (میزان الاعتدال: ۱۳۷/۲) کہنا بے معنی ہے۔

اسی طرح امام ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ کا شیخ یکتب حدیثہ ولا یحتج بہ کہنا بھی جمہور کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابل التفات ہے۔

امام احمد بن حنبل (السنة للخلال: ص ۴۱۹)، امام ابن حبان (۶۶۵۷)، امام ابن ابی عاصم (السنة: ۱۲۲۲) اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ (مجموع الفتاوی: ۱۸/۳۵) رحمہم اللہ نے اس حدیث کو، جبکہ امام حاکم رحمہ اللہ (المستدرک: ۷۷/۳) اور بوسیری (اتحاف الخیرة: ۲۷۶/۸) نے اس کی سند کو ”صحیح“ کہا ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ (سنن ترمذی: ۲۴۲۶) اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (مواقفة الخبر الخبر: ۱۴۷/۱) نے اس

حدیث کو ”حسن“ قرار دیا ہے۔

ساتھ ہی حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ”سعید بن جہمان صغیر تابعی اور صدوق راوی تھے۔“ کسی ثقہ محدث نے اس حدیث پر کلام نہیں کیا، بلکہ محدثین کرام نے اس حدیث کی ”تصحیح“ کر کے اسے قبول کیا ہے، لہذا ابن خلدون مؤرخ (تاریخ ابن خلدون: ۴۵۸/۲) اور ابن العربی مالکی (العواصم من القواصم: ص ۲۰۱) کا اسے بغیر دلیل کے صحیح تسلیم نہ کرنا بے وقعت ہے۔

حدیث سفینہ سے محدثین کا استدلال

① امام اہل سنت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے بارے میں میمون بن بیان کرتے ہیں: ”میں نے امام احمد سے سنا، ان سے سوال کیا گیا کہ آپ کا خلافت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ فرمایا، ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہ (ہی خلیفہ تھے)، کہا گیا، گویا کہ آپ حدیث سفینہ کی طرف جاتے ہیں؟ فرمایا، میں حدیث سفینہ کی طرف بھی جاتا ہوں اور ایک اور چیز کی طرف بھی، وہ یہ کہ میں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے کہ وہ سیدنا ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے دور میں امیر المؤمنین کے نام سے موسوم نہیں ہوئے، نہ ہی آپ نے جماعت و جمعہ اور حدود قائم کی ہیں، لیکن سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ نے یہ کام کیا ہے، معلوم ہوا کہ اس وقت آپ کے لیے وہ کام واجب ہو گیا تھا، جو پہلے واجب نہ تھا۔“ (الاعتقاد للبيهقي: ۴۶۹، وسنده صحيح) نیز امام موصوف فرماتے ہیں: ”خلافت کے بارے میں ہم حدیث سفینہ کی طرف جاتے ہیں۔“ (مسائل الامام احمد لعبد الله: ۱۸۳۳)

② امام ابوالحسن الاشعری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”یہ حدیث ائمہ اربعہ کی خلافت پر دلالت کرتی ہے۔“ (ابانة عن اصول الديانة للاشعري: ۲۵۱)

اسی طرح ③ امام ابن حبان رحمہ اللہ (صحيح ابن حبان: ۶۶۵۷) ④ امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ (صريح السنة: ح ۷) ⑤ امام الآجری (الشريعة: ۵۶۴) اور امام بیہقی (الاعتقاد: ۴۶۷) رحمہم اللہ بھی اس حدیث سے خلفائے اربعہ کا ہی اثبات کرتے ہیں



نماز میں سلام کا جواب!

نمازی کو سلام کہنا جائز اور صحیح ہے، حالت نماز میں سلام کا جواب کلام کر کے نہیں، بلکہ اشارے کے ساتھ دینا سنت ہے، کلام کر کے سلام کا جواب لوٹانا منسوخ ہے۔

دلیل نمبر ①: عن جابر، قال: أرسلني رسول الله صلى الله

عليه وسلم، وهو منطلق الى بني المصطلق، فأتيته وهو يصلي على بعيره، فكلّمته، فقال لي بیده هكذا، وأوماً زهير بیده، ثم كلّمته، فقال لي هكذا، فأوماً زهير أيضاً بیده نحو الأرض، وأنا أسمعہ يقرأ، يؤمىء برأسه، فلما فرغ قال: ما فعلت في الذي أرسلتک له؟ فانه لم يمعني أن أكلّمک الا أني كنت أصلي.

سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے بنو مصطلق کی طرف بھیجا، میں آپ ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ اونٹ پر (نفلی) نماز پڑھ رہے تھے، میں نے آپ پر سلام کہا، آپ ﷺ نے ہاتھ کے اشارے سے جواب لوٹایا (زهیر راوی نے ہاتھ سے اشارہ کر کے دکھایا)، میں نے پھر آپ ﷺ کو سلام کہا، آپ ﷺ نے پھر ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا (زهیر نے اپنا ہاتھ زمین کی طرف جھکایا)، میں آپ ﷺ کی قراءت سن رہا تھا، آپ ﷺ اپنے سر کے ساتھ اشارہ فرما رہے تھے۔ جب آپ ﷺ فارغ ہوئے تو فرمایا، میں نے تجھے جس کام کے لیے بھیجا تھا، اس بارے میں کیا کیا؟ مجھے کلام کرنے سے صرف یہ بات روک رہی تھی کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔“

(صحیح بخاری: ۱۲۱۷، صحیح مسلم: ۵۴۰، واللفظ له)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نمازی کو سلام کہنے اور اس کا اشارے سے جواب لوٹنا جائز ہے۔

دلیل نمبر ②: سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم الى قباء يصلي فيه، قال: فجاءته

الأنصار ، فسَلَّموا عليه وهو يصَلِّي ، قال : فقلت لبلال : كيف رأيت رسول الله صَلَّى الله عليه وسلَّم يردّ عليهم حين كانوا يسَلِّمون عليه ، وهو يصَلِّي ؟ قال : يقول هكذا ، وبسط كَفَّهُ . ”نبی اکرم ﷺ مسجد قباء میں نماز کے لیے نکلے، انصار صحابہ آئے اور انہوں نے آپ ﷺ کو سلام کہا، آپ ﷺ نماز میں تھے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں، میں نے بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ ﷺ حالت نماز میں کس طرح جواب لوٹاتے تھے؟ اس پر سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے اپنی ہتھیلی پھیلائی۔ (راوی جعفر بن عون نے اپنی ہتھیلی کا باطنی حصہ نیچے کی طرف اور اس کی پشت اوپر کی طرف کی)۔“ (سنن ابی داؤد: ۹۲۷، سنن الترمذی: ۳۶۸، مسند الامام احمد: ۱۲/۶، وسندہ حسن)

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ”حسن صحیح“ کہا ہے۔ امام ابن الجارود رحمہ اللہ (۲۱۵) اور حافظ نووی رحمہ اللہ (خلاصۃ الاحکام: ۵۰۸/۱) نے ”صحیح“ قرار دیا ہے۔

دلیل نمبر ③ : عن صهيب أنه قال : مررت برسول الله صَلَّى الله عليه وسلَّم ، وهو يصَلِّي ، فسَلَّمْتُ عليه ، فردّ إشارةً . ”سیدنا صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرا، آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے، میں نے آپ ﷺ پر سلام کہا، آپ ﷺ نے اشارے کے ساتھ جواب دیا۔“ (سنن ابی داؤد: ۹۲۵، سنن الترمذی: ۳۶۷، سنن النسائی: ۱۱۸۷، مسند الامام احمد: ۳۳۲/۴، وسندہ صحیح)

اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے ”حسن“ کہا ہے، جبکہ امام ابن الجارود رحمہ اللہ (۲۱۶) اور امام ابن حبان رحمہ اللہ (۲۲۵۹) نے ”صحیح“ قرار دیا ہے۔

اس حدیث کا ایک شاہد ”صحیح“ سند کے ساتھ سنن النسائی (۱۱۸۸)، سنن ابن ماجہ (۱۰۱۷) اور مسند الحمیدی (۱۴۸) وغیرہ میں موجود ہے۔ اس کو امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ (۸۸۸) اور امام ابن حبان رحمہ اللہ (۲۲۵۸) نے ”صحیح“ کہا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ (۱۲/۳) نے اسے بخاری و مسلم کی شرط پر ”صحیح“ کہا ہے، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

ان احادیث مبارکہ سے ثابت ہوا کہ نمازی کو سلام کہنا اور اس کا اشارے کے ساتھ جواب لوٹانا

جائز اور درست ہے۔

دلیل نمبر ④ : اَنَّ عبد اللہ بن عمر مَرَّ علی رجل ، وهو یصلّی ،

فسلمّ علیہ ، فردّ الرّجل کلاماً ، فرجع الیہ عبد اللہ بن عمر ، فقال له : اذا سلمّ علی

أحدکم ، وهو یصلّی ، فلا یتکلم ، ولیشر بیدہ . ”سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایک

آدمی کے پاس سے گزرے ، وہ نماز پڑھ رہا تھا ، آپ نے اسے سلام کہا ، اس نے بول کر جواب دیا ،

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس کی طرف لوٹے اور اسے فرمایا ، جب تم میں سے کسی ایک کو سلام کہا جائے

اور وہ نماز پڑھ رہا ہو تو وہ کلام نہ کرے ، بلکہ اپنے ہاتھ کے ساتھ اشارہ کر دے۔“ (الموطا للامام مالک :

۱۶۸/۱ ، مصنف ابن ابی شیبہ : ۷۴/۲ ، ح : ۴۷۴۹ ، واسنادہ صحیح کالشمس وضوحاً)

دلیل نمبر ⑤ : عن عطاء أنّ موسیٰ بن عبد اللہ بن جمیل

الجمحیّ سلمّ علی ابن عباس ، وهو یصلّی ، فأخذہ بیدہ . ”عطاء بن ابی

رباح رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ موسیٰ بن عبداللہ بن جمیل حجازی نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو سلام کہا ، آپ

نماز میں تھے ، آپ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا (یہ آپ کی طرف سے سلام کا جواب تھا)۔“

(السنن الکبریٰ للبیہقی : ۲۵۹/۲ ، مصنف ابن ابی شیبہ : ۷۳/۲ ، وسندہ صحیح)

دلیل نمبر ⑥ : عن أبی مجلز ، سئل عن الرّجل یسلمّ علیہ فی

الصّلاة ، قال : یردّ بشقّ رأسہ الأیمن . ”ابو مجلز (لاحق بن حمید تابعی) رضی اللہ عنہ سے

ایسے نمازی کے بارے میں سوال کیا گیا ، جس کو سلام کہا جائے ، آپ نے فرمایا ، وہ اپنے سر کی دائیں

جانب کے ساتھ (اشارہ کرتے ہوئے) جواب لوٹائے۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ : ۷۳/۲ ، ح : ۴۸۵۰ ، وسندہ صحیح)

امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں : ان شاء أشار وأما بالکلام فلا یردّ .

”نمازی اگر چاہے تو اشارے سے سلام کا جواب دے دے ، لیکن زبان سے کلام کر کے جواب

نہ لوٹائے۔“ (مسائل احمد لابی داؤد : ص ۳۷ ، مسائل احمد لابی ہانی : ۴۴/۱)

تنبیہ ① : امام اسحاق بن راہویہ، امام احمد بن حنبل اور امام سفیان الثوری رحمہم اللہ سے

روایت ہے، ان کا قول ہے: ”اذا ردّ علیہ استقبال الصّلاة . ”جب نمازی سلام

کا جواب لوٹائے تو وہ از سر نو نماز پڑھے۔“ (مسائل احمد واسحاق: ۸۳/۱)

اس قول سے ان ائمہ کی مراد یہ ہے کہ اگر کسی نمازی کو معلوم ہو کہ نماز میں زبان سے سلام کا جواب

دینا ممنوع اور منسوخ ہے، اس کے باوجود وہ ایسا کرے تو اسے نماز لوٹانی ہوگی، کیونکہ اس نے جان

بوجھ کر نماز میں کلام کر دی ہے، ہم بھی یہی کہتے ہیں۔

تنبیہ ② : اگر حالت نماز میں جہالت کی بنا پر بھول کر سلام کے جواب میں

”وعلیکم السلام“ کہہ دے تو نماز باطل نہیں ہوگی۔

اعتراض ① : ”خفیہ کہتے ہیں کہ نماز میں آپ ﷺ کا اشارہ حالت نماز میں

سلام کہنے کی ممانعت کے بارے میں تھا، نہ کہ سلام کے جواب میں۔“ (شرح معانی الآثار: ۴۵۷/۸)

جواب : ان کا یہ بے دلیل قول مذکورہ بالا احادیث و آثار، جو حالت نماز میں اشارے

سے سلام لوٹائے جانے کے بارے میں واضح ہیں، ان کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود و باطل ہے۔

اعتراض ② : عن عبد اللہ رضی اللہ عنہ ، قال : كنت أسلم علی

النّبی صلی اللہ علیہ وسلم ، وهو فی الصّلاة ، فیردّ علیّ ، فلما رجعنا ، سلّمت علیہ

، فلم یردّ علیّ ، وقال : إنّ فی الصّلاة شغلاً . ”سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کو حالت نماز میں سلام کہہ دیا کرتا اور آپ مجھے جواب دے دیا

کرتے تھے، یہاں تک کہ جب ہم نجاشی کے پاس سے واپس آئے تو میں نے آپ ﷺ کو نماز میں

سلام کہا، آپ ﷺ نے جواب نہ دیا، (جب یہ بات آپ ﷺ سے پوچھی گئی تو) آپ نے فرمایا، نماز

میں (قرآن کی قراءت، ذکر اور دعاؤں کی) مشغولیت ہوتی ہے۔“

(صحیح بخاری: ۱۲۱۶، صحیح مسلم: ۵۳۸)

جواب : یہ حدیث دلیل ہے کہ نماز میں زبان سے سلام کا جواب لوٹنا منسوخ ہے، اس سے ہاتھ کے اشارے سے سلام کا جواب لوٹانے کی نفی نہیں ہوتی، بلکہ اس کا جواز دوسری صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

اعتراض ③ : سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”لا غرار فی صلاة ولا تسلیم .“ ”نماز اور سلام میں نقصان نہیں ہے۔“

(سنن ابی داؤد: ۹۲۸، مسند الامام احمد: ۴۶۷/۲، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۲۶۷/۲، المستدرک

للحاکم: ۲۶۴/۱)

امام حاکم نے اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ کی شرط پر ”صحیح“ کہا ہے، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

جواب : یہ حدیث سفیان ثوری رحمہ اللہ کی ”تدلیس“ کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے، سماع کی

تصریح نہیں مل سکی۔ اگر اس کو ”صحیح“ مان بھی لیا جائے اور یہ معنی کر لیا جائے کہ نماز میں نقصان اور سلام نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سلام باللفظ نہیں ہے۔ اشارے کے ساتھ سلام کا جواب تو صحیح احادیث، آثارِ صحابہ و تابعین سے ثابت ہے۔

اعتراض ④ : سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”من أشار فی صلاته إشارة تفہم عنه ، فليعد لها .“ ”جو آدمی اپنی نماز میں ایسا

اشارہ کرے، جو اس کی طرف سے سمجھ لیا جائے، وہ اپنی نماز دہرائے۔“

(سنن ابی داؤد: ۹۴۴، سنن الدارقطنی: ۸۳/۲، شرح معانی الآثار للطحاوی: ۴۵۳/۱)

جواب : یہ حدیث ”ضعیف“ ہے، اس میں محمد بن اسحاق (حسن الحدیث، وثقہ

الجمہور) مشہور ”مدلس“ ہیں، جو کہ بصیغہ عن روایت کر رہے ہیں، سماع کی تصریح نہیں ملی، پھر یہ ”صحیح“

احادیث کے خلاف بھی ہے۔

اعتراض ⑤ : طحاوی حنفی ایک دلیل لائے ہیں کہ:

عن أبي سفيان ، قال : سمعت جابرا رضى الله عنه يقول : ما أحب أن أسلم على الرجل ، وهو يصلي ، ولو سلم على لرددت عليه . ”ابوسفیان کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا جابر بن عبد اللہ الانصاری رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے، میں نمازی پر سلام کہنا پسند نہیں کرتا، لیکن اگر اس نے مجھے سلام کہہ دیا تو میں اس کا جواب لوٹاؤں گا۔“

(شرح معانی الآثار للطحاوی : ٤٥٧/١ ، واسنادہ حسن)

جناب ظفر احمد تھانوی دیوبندی کہتے ہیں کہ یہ ابوسفیان طریف السعدی ہے، جو کہ سخت متکلم فیہ ہے۔ (اعلاء السنن : ٣٤/٥)

ہم کہتے ہیں کہ تھانوی صاحب اس راوی کے تعین میں وہم و تخلیط کا شکار ہو گئے ہیں، یہ ابوسفیان طریف السعدی نہیں، بلکہ ابوسفیان طلحہ بن نافع الواسطی ہے، جس کی جمہور نے ”توثیق“ کر رکھی ہے اور یہ ”حسن“ درجہ کا راوی ہے۔

طحاوی حنفی کہتے ہیں کہ لرددت ، یعنی میں سلام کا جواب لوٹاؤں گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے بعد لوٹاؤں گا، اس پر دلیل یہ پیش کی ہے کہ:

سأل سليمان بن موسى 'عطاء : أسألت جابرا عن الرجل يسلم عليك ، وأنت تصلي ، فقال : لا ترد عليه حتى تقضى صلاتك ؟ فقال : نعم !

”سليمان بن موسى نے عطاء بن ابی رباح سے سوال کیا کہ کیا آپ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے ایسے انسان کے بارے میں پوچھا ہے، جو حالت نماز میں آپ پر سلام کہے اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا تھا کہ اس پر سلام مت کہو، یہاں تک کہ نماز پوری کر لو؟ اس پر عطاء بن ابی رباح رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ہاں! (میں نے سوال کیا تھا اور انہوں نے یہ جواب دیا تھا)۔ (شرح معانی الآثار للطحاوی : ٤٥٧/١)

لیکن یہ روایت ”ضعیف“ ہے، اس کے ایک راوی علی بن زید کے بارے میں امام ابن یونس مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”تکلموا فیہ .“ ”محدثین نے اس کے بارے میں کلام

(جرح) کی ہے۔“ (لسان المیزان لابن حجر : ۳۳۰/۴)

اس جرح کے برعکس اس کے بارے میں کوئی ”توثیق“ ثابت نہیں ہے۔

اعتراض ⑥ : جناب ظفر احمد تھانوی دیوبندی ”لسان المیزان“ کے حوالے سے

لکھتے ہیں کہ مسلمہ بن قاسم نے اس کو ”ثقة“ کہا ہے۔ (اعلاء السنن : ۳۳/۵)

جواب : ہم کہتے ہیں کہ مسلمہ بن قاسم خود ”ضعیف“ ہے۔

(سیر اعلام النبلاء للذهبی : ۱۱۰/۱۶، میزان الاعتدال للذهبی : ۱۱۲/۴)

جو شخص تھانوی صاحب کی طرح خود ”ضعیف“ ہو، اس کا دوسرے کو ”ثقة“ کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟
تھانوی صاحب اس روایت کے ایک دوسرے راوی ہمام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ ہمام بن منبہ ہے۔
ہم کہتے ہیں کہ اس پر کیا دلیل ہے کہ یہ ہمام بن منبہ ہے؟

الحاصل : جب امام طحاوی حنفی کی بیان کردہ دلیل ”ضعیف“ ہوگئی تو ان کا بیان کردہ

مفہوم و مطلب ضعیف ہو گیا۔ لرد دت سے مراد ہے کہ میں اس کو سلام کا جواب اشارے سے
لوٹاؤں گا، جیسا کہ حدیث جابر صحیح مسلم میں اور دوسری صحیح احادیث اور آثار صحابہ سے پتا چلتا ہے۔
صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے زمین کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔

اعتراض ⑦ : جناب تھانوی صاحب اس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فلو كانت هذه الاشارة لردة السلام لكانت الى فوق ، لا الى الأرض .

”اگر یہ اشارہ سلام کا جواب لوٹانے کے لیے ہوتا تو اوپر کی طرف اشارہ ہوتا، نہ کہ زمین کی

طرف۔“ (اعلاء السنن : ۳۳/۵)

جواب : یہ کہاں لکھا ہے کہ سلام کے لیے اشارہ اوپر کی جانب ہوتا ہے، محدثین کا فہم

مقدم ہوگا۔ محدثین نے اس سے وہی مسئلہ سمجھا ہے، جو ہم ذکر کر چکے ہیں کہ یہ سلام کا جواب ہی تھا۔

اعتراض ⑧ : عن جابر بن عبد الله رضي الله عنهما ، قال : بعثني

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حاجة له ، فانطلقت ، ثم رجعت ، وقد قضيتها ، فأتيت النبي صلی اللہ علیہ وسلم ، فسلمت عليه ، فلم يردّ عليّ ، فوقع في قلبي ما اللہ أعلم به ، فقلت في نفسي : لعلّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وجد عليّ أنّي أبطأت عليه ، ثم سلمت عليه ، فلم يردّ عليّ ، فوقع في قلبي أشدّ من المرة الأولى ، ثم سلمت عليه ، فردّ عليّ ، فقال : انما منعني أن أردّ عليك أنّي كنت أصلي ، وكان علي راحلته متوجّها الى غير القبلة .

”سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے کسی کام کی غرض سے بھیجا۔ میں کام مکمل کر کے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ کو سلام کہا، آپ ﷺ نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ میرے غم و حزن کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے، میں نے دل میں کہا کہ شاید رسول اللہ ﷺ تاخیر کی وجہ سے مجھ پر ناراض ہو گئے ہیں۔ دوبارہ میں نے آپ ﷺ کو سلام کہا، آپ ﷺ نے جواب نہ لوٹایا، میرے دل میں پہلے سے بھی زیادہ حزن و ملال پیدا ہوا۔ پھر میں نے آپ کے سلام پھیرنے کے بعد آپ ﷺ کو سلام عرض کیا تو آپ ﷺ نے جواب ارشاد کیا اور فرمایا، بے شک مجھے آپ کے سلام کا جواب دینے سے صرف نماز نے منع کیا تھا۔“

(صحیح بخاری : ۱۲۱۷، صحیح مسلم : ۵۴۰)

جناب تھانوی لکھتے ہیں : فانہ كالصريح في أنّه صَلَّى اللہ علیہ وسلم لم يردّ علي جابر ، لا اشارة ولا لفظا ، ولو كان ردّ عليه اشارة لم يقع في قلب جابر ما وقع ، فتقييده بالكلام غير سديد ، وأيضا لو كان صَلَّى اللہ علیہ وسلم ردّ عليه بالاشارة لم يحتج الى الردّ عليه بعد الفراغ ، كما هو مذهب من يبيح الردّ بالاشارة ، وقد ثبت أنّه ردّ عليه بعد ما انصرف عن صلاته ، وهو المأثور من مذهب جابر ... ”اس میں گویا صراحت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا جابر کو نہ اشارتاً جواب دیا تھا نہ ہی لفظاً۔ اگر آپ ﷺ نے اشارہ سے جواب دیا ہوتا تو سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کے دل میں غم و حزن پیدا نہ

ہوتا۔ اس کو اس بات پر مقید کرنا کہ یہ سلام کا جواب بلا اشارہ تھا نہ کہ بالكلام، کوئی پختہ رائے نہیں ہے، اسی طرح اگر آپ ﷺ نے سلام کا جواب بلا اشارہ لوٹایا ہوتا تو نماز سے فراغت کے بعد بالكلام سلام کا جواب لوٹانے کی کیا ضرورت تھی؟ جو اشارہ کے ساتھ سلام کا جواب لوٹنا جائز سمجھتا ہے، وہ تو ایسا نہیں کرتا۔ نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے سلام پھیرنے کے بعد سلام کا جواب لوٹایا۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی مذہب ہے۔“ (اعلاء السنن: ۳۳/۵)

تھانوی صاحب کی یہ کلام حقیقت پر مبنی نہیں ہے، کیونکہ صحیح مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کو ہاتھ کے اشارہ سے سلام کا جواب لوٹایا ہے۔ اس سے صحیح بخاری والی روایت کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ احادیث ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں۔ رہا یہ مسئلہ کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کے دل میں غم کیوں پیدا ہوا تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

فيحمل في حديث الباب ((فلم يردّ عليّ)) أي باللفظ ، وكأنّ جابرا لم يعرف أولاً أنّ المراد بالاشارة الردّ ، فلذلك قال : فوقع في قلبي ما الله أعلم به ، أي من الحزن . ”سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ آپ ﷺ نے مجھ پر جواب نہیں لوٹایا، اس کا مطلب یہ ہے کہ بالتلفظ نہیں لوٹایا، گویا کہ پہلے پہل سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کو علم نہ تھا کہ اشارے سے مراد جواب ہے، اسی لیے تو انہوں نے کہا کہ میرے دل میں وہ حزن و ملال پیدا ہوا، جسے اللہ ہی جانتا ہے۔“

(فتح الباری لابن حجر: ۸۷/۳)

تھانوی صاحب کا یہ کہنا کہ جواب نہ لوٹانے کو کلام کے ساتھ مقید کرنا پختہ رائے نہیں ہے، صحیح مسلم کی حدیث اس کا رد کرتی ہے، بلکہ دیگر احادیث و آثار بھی اس کی تردید کرتے ہیں۔ باقی رہا نبی اکرم ﷺ نے بعد نماز سلام کا جواب لوٹانے کی کیا ضرورت محسوس کی، روایت میں واضح ہے کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے آپ کو نماز میں اور سلام پھیرنے کے بعد دونوں کیفیتوں میں سلام کہا، حالت نماز میں آپ ﷺ نے سلام کا جواب اشارہ سے اور سلام پھیرنے کے بعد زبان سے بول کر فرمایا، اتنی سی بات تھانوی صاحب کو سمجھ نہ آ سکی اور وہ حدیث کی تاویل کے درپے ہو گئے۔

ظفر احمد تھانوی صاحب نے یہ ذکر کیا ہے کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا مذہب یہ تھا کہ اگر نمازی پر سلام کہا جائے تو وہ بعد نماز ہی جواب دے گا، اس کے ثبوت پر جودلیل دی ہے، وہ ”ضعیف“ ہے، جیسا کہ پیچھے اس کا بیان ہو چکا ہے۔ بالفرض تھانوی صاحب کی بات درست مان بھی لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نمازی پر سلام کہا جاسکتا ہے، اگر وہ جواب نہ دے تو کوئی حرج نہیں، اگر دے تو جائز ہے، وہ بھی بلا اشارہ جواب دے سکتا ہے۔ کلام کر کے جواب دینا ممنوع ہے۔ ہم بھی نماز میں اشارے سے سلام کے جواب کو ضروری قرار نہیں دیتے، بلکہ صرف جواز کے قائل ہیں۔

اعتراض ⑨ : عن جابر بن سمرة ، قال : خرج علينا رسول الله صلى

الله عليه وسلم ، فقال : ما لي أراكم رافعي أيديكم ، كأنها أذناب خيل شمس ؟ اسكنوا في الصلاة . ”سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا، کیا بات ہے کہ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کہ تم سرکش گھوڑوں کی دموں کی طرح اپنے ہاتھ اٹھا رہے ہو، نماز میں سکون اختیار کرو۔“ (صحیح مسلم: ۴۳۰)

اس بات پر علمائے کرام کا اجماع و اتفاق ہے کہ اس حدیث کا تعلق تشہد اور سلام کے ساتھ ہے، جیسا کہ صحیح مسلم کی دوسری حدیث سے ثابت ہے کہ وہ نماز میں سلام پھیرتے وقت دائیں بائیں ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے تو نبی اکرم ﷺ نے ان کو منع فرمادیا۔ نماز میں سلام کا جواب اشارے کے ساتھ لوٹانا نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام سے ثابت ہے۔

اگر اس حدیث سے نماز سے سلام کے جواب کے بارے میں عدم جواز ثابت ہوتا ہے تو تقلید پرست ان احادیث کا کیا جواب دیں گے، جن میں اشارے کا ذکر ہے۔ اگر وہ کہیں کہ اس حدیث سے نماز میں سلام بلا اشارہ کی منسوخیت ثابت ہوتی ہے تو ان کا یہ قول باطل و مردود ہے، جیسا کہ گزشتہ دلائل سے ثابت ہے۔

اگر وہ کہیں کہ نماز میں اشارے سے سلام کا جواب دینا سکون کے منافی ہے تو وہ خود و تروں میں اور عیدین میں رفع الیدین کیوں کرتے ہیں؟ جو جواب ان کا ہوگا، وہی ہمارا جواب ہوگا۔



سند دین ہے، دین اسلام کا دار و مدار اور انحصار سند پر ہے، سند ہی حدیث رسول ﷺ تک پہنچنے کا واحد طریقہ ہے، نیز سند احکام شرعی کی معرفت کا واحد ذریعہ ہے۔ سند امت محمدیہ ﷺ کا خاصہ ہے، اہل حدیث اس کے وارث اور محافظ ہیں۔

اہل باطل ہمیشہ سند سے دور رہے ہیں، ان کی کتابیں اس سے خالی ہیں، ان سے سند کا مطالبہ بجلی بن کر گرتا ہے، لہذا جب بھی کوئی بدعتی اور ملحد آپ کو کوئی روایت پیش کرے تو آپ فوراً اس سے معتبر کتب حدیث سے سند، نیز راویوں کی توثیق و عدالت، اتصال سند، تدلیس اور اختلاط سے سند کے خالی ہونے کا مطالبہ کریں، وہ فُبْهَتْ الَّذِي كَفَرَ کا صحیح مصداق بن جائے گا۔

سند اور محدثین

امام یزید بن زریج رحمہ اللہ (م ۱۸۲ھ) فرماتے ہیں: لکلّ دین فرسان و فرسان هذا الدّین أصحاب الأسماء . ”ہر دین کے شہسوار ہوتے ہیں اور اس دین کے شہسوار سندوں والے لوگ ہیں۔“ (المدخل للحاکم: ۱۲، شرف اصحاب الحدیث للخطیب: ۸۲، وسندہ حسن) اس قول کی تشریح کرتے ہوئے امام ابن حبان رحمہ اللہ (م ۳۵۴ھ) لکھتے ہیں:

فرسان هذا العلم الذّین حفظوا علی المسلمین الدّین ، وهدوهم الی الصّراط المستقیم ، الذّین أكثروا قطع المفاوز والقفار ، علی التّنعم فی الدّیار والأوطان فی طلب السنن فی الأمصار ، وجمعها بالوجل والأسفار ، والدّوران فی جمیع الأفطار ، حتّی انّ أحدهم لیرحل فی الحدیث الواحد الفراسخ البعیدة ، وفی الکلمة الواحدة الأيام الكثيرة ، لتلا یدخل مضلّ فی السنن شیئا یضلّ به ، وان فعل فہم الذّابّون عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم ذلک الکذب ، والقائمون بنصرة الدّین ...

”اس علم کے شہسوار وہ لوگ ہیں، جنہوں نے مسلمانوں کے لیے ان کے دین کو محفوظ کیا اور ان کی رہنمائی صراطِ مستقیم کی طرف کی، وہ لوگ جنہوں نے ناز و نعمت اور اپنے علاقوں میں رہنے پر احادیثِ رسول ﷺ کی طلب میں صحرا و بیاباں طے کر کے دور دراز کے شہروں میں جانے کو ترجیح دی، انہوں نے خوف و سفر اور تمام اطراف و اکناف میں گھوم کر یہ کام کیا، حتیٰ کہ ان میں سے کوئی ایک حدیث کی خاطر کئی کئی فرسخ اور ایک ہی کلمہ کی خاطر کئی دن سفر کرتا، تاکہ کوئی گمراہ کن شخص احادیث میں ایسی چیز داخل نہ کر دے، جس کے ذریعے وہ لوگوں کو گمراہ کرے۔ اگر کسی نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو انہی لوگوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے اس جھوٹ کو دُور کیا، یہی لوگ دین کی نصرت کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔“ (المجروحین لابن حبان: ۲۷/۱)

امام شافعی رحمہ اللہ (۱۵۰-۲۰۴ھ) فرماتے ہیں: مثل الذی يطلب العلم بلا حجة، مثل حاطب لیل، یحمل حمزة حطب فیہا أفعی، یدلغہ وهو لا یدری ... ”جو شخص بغیر دلیل (سند) کے علم حاصل کرتا ہے، وہ رات کو لکڑیاں اکٹھی کرنے والے کی طرح ہے کہ وہ لکڑیوں کا وہ گٹھا جمع کرتا ہے، جس میں اڑدھا ہوتا ہے، اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ اس کو ڈنگ دیتا ہے۔“ (المدخل للحاکم: ۴، وسندہ حسن)

امام محمد بن سیرین تابعی رحمہ اللہ (م ۱۱۰ھ) فرماتے ہیں: انّ هذا الحديث دین، فانظروا عمن تأخذوه. ”یہ حدیث دین ہے، لہذا تم دیکھو کہ کس سے دین لے رہے ہو۔“ (الجرح والتعديل لابن ابی حاتم: ۱۵/۲، وسندہ صحیح)

شیخ الاسلام امام عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ (م ۱۸۱ھ) فرماتے ہیں: الاسناد من الدین، ولولا الاسناد لقال من شاء ما شاء. ”سند دین ہے، اگر سند نہ ہوتی تو ہر کہنے والا، جو اس کے جی میں آتا، کہہ دیتا۔“ (مقدمة صحيح مسلم: ۹/۱، رقم: ۳۲، وسندہ صحیح)

امام حاکم رحمہ اللہ (م ۴۰۵ھ) فرماتے ہیں: لولا الاسناد وطلب هذه الطائفة له، وكثرة مواظبتهم على حفظه، لدرس منار الاسلام، ولتمكّن أهل اللاحاد

والبدع فيه بوضع الحديث ، وقلب الأسانيد ، فإن الأخبار اذا تعرت عن وجود الأسانيد فيها كانت بُترا ... ”اگر سند نہ ہوتی اور محدثین کا یہ گروہ اس کو حاصل نہ کرتا اور اس کی حفاظت پر تسلسل نہ رکھتا تو اسلام کا مینار منہدم ہو جاتا اور ملحد و بدعتی لوگ حدیث کو گھڑنے اور سندوں کو بدلنے پر قادر ہو جاتے۔ احادیث جب سندوں کی وجود سے عاری ہو جائیں تو وہ ادھوری اور بے فیض ہو جاتی ہیں۔“ (معرفة علوم الحديث للحاکم: ص ۶)

نیز فرماتے ہیں: سمعت الشيخ أبا بكر أحمد بن اسحاق الفقيه ، وهو يناظر رجلا ، فقال الشيخ : حدّثنا فلان ، فقال له الرّجل : دعنا من حدّثنا الى متي حدّثنا ، فقال له الشيخ : قم يا كافر ! ولا يحلّ لك أن تدخل داري بعد هذا ، ثم التفت اليها ، فقال : ما قلت قطّ لأحد لا تدخل داري الا لهذا

”میں نے شیخ ابوبکر احمد بن اسحاق فقیہ کو ایک آدمی سے مناظرہ کرتے ہوئے سنا، شیخ نے سند پڑھی تو اس آدمی نے کہا، سند کو چھوڑو، اس پر شیخ نے کہا، اے کافر! کھڑا ہو جا، تیرے لیے اب کے بعد میرے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں، پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا، میں نے اس آدمی کے سوا کبھی کسی کو اپنے گھر میں داخل ہونے سے منع نہیں کیا۔“ (معرفة علوم الحديث للحاکم: ص ۴)

ابونصر أحمد بن سلام الفقيه کہتے ہیں: ليس شيء أثقل على أهل الالحاد ولا أبغض اليهم من سماع الحديث وروايته باسناد ... ”ملحدین پر حدیث کو سننے اور اس کو باسند روایت کرنے سے بڑھ کر کوئی کام بھاری و مبغوض نہیں۔“ (معرفة علوم الحديث للحاکم: ص ۴ ، شرف اصحاب الحديث للخطيب: ۱۵۲، وسنده صحيح)

نیز امام عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مثل الذي يطلب أمر دينه بلا اسناد كمثل الذي يرتقى السطح بلا سلم . ”جو شخص اپنے دین کو بغیر سند کے حاصل کرتا ہے، اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے، جو چھت پر بغیر سیڑھی کے چڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔“

(شرف اصحاب الحديث للخطيب: ۷۵ ، وسنده صحيح)

ابوسعید الخدری رحمہ اللہ کہتے ہیں: الاسناد مثل الدرّج ومثل المراقى ، فاذا زلّت

رجلک عن المرقاة سقطت ، والرأى مثل المرج . ”اسناد سیڑھی اور اس کے زینوں کی طرح ہے، اگر آپ کا پاؤں سیڑھی سے پھسلے تو آپ گر جاتے ہیں۔ رائے تو فتنہ و فساد کی طرح ہے۔“ (شرف اصحاب الحديث للخطيب: ۷۶، وسنده حسن)

حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ (م ۶۴۳ھ) لکھتے ہیں: أصل الاسناد خصیصة فاضلة من خصائص هذه الأمة ، وسنة بالغة من السنن المؤكدة . ”سند اس امت کی خصوصیات میں سے ایک زبردست خصوصیت ہے اور مؤکدہ سنتوں میں سے بلیغ سنت ہے۔“

(مقدمة ابن الصلاح : ص ۲۳۱)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (م ۷۲۸ھ) فرماتے ہیں: الاسناد من خصائص هذه الأمة ، وهو من خصائص الاسلام ، ثم هو في الاسلام من خصائص أهل السنة ، والرافضة من أقل الناس عناية به ، اذ كانوا لا يصدّقون الا بما يوافق أهوائهم ، وعلامة كذبه أنهم يخالف أهوائهم . ”اسناد اس امت کا خاصہ ہے، اسلام کا خاصہ ہے، پھر اہل اسلام میں سے اہل سنت کا خاصہ ہے۔ اس کی طرف سب لوگوں میں سے کم توجہ رافضی کرتے ہیں، کیونکہ وہ صرف اس سند کی تصدیق کرتے ہیں، جو ان کی خواہشات کے موافق ہو اور (ان کے نزدیک) سند کے جھوٹا ہونے کے علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ ان کی خواہشات کے خلاف ہو۔“

(منهاج السنة النبوية : ۱۷/۴)

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ (م ۴۵۶ھ) لکھتے ہیں: ”ثقة كالثقة سے نقل کرنا، حتیٰ کہ یہ سلسلہ اتصال کے ساتھ نبی اکرم ﷺ تک پہنچ جائے، ہر ایک راوی اپنے شیخ کا نام و نسب بیان کرے، سب کی ذات اور ان کے احوال و زمان و مکان معروف ہوں یہ خصوصیت (سند) اللہ تعالیٰ نے باقی سب امتوں میں سے صرف مسلمانوں کو دی ہے اور اس خصوصیت کو ان کے ہاں قدیم زمانوں کے باوجود تروتازہ و شگفتہ رکھا ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے اتنے لوگ دور دراز آفاق کا سفر کرتے ہیں کہ ان کا شمار ان کا خالق ہی کر سکتا ہے۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، لہذا اگر ان میں سے کسی سے نقل کرنے میں ایک کلمہ کی بھی غلطی ہو جائے تو وہ ان سے بچ کر نہیں نکلتی، نہ

ہی کسی فاسق کے لیے ممکن ہے کہ وہ اس میں کوئی ایک بھی من گھڑت کلمہ داخل کر سکے۔ واللہ تعالیٰ اشکر!

یہود: ارسال اور انقطاع کے ساتھ سند یہود میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے، لیکن وہ اس کے ذریعے بھی سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے قریب نہیں پہنچ پاتے، بلکہ وہ موسیٰ علیہ السلام سے اتنا دور رک جاتے ہیں کہ ان کے درمیان تیس زمانوں سے بھی زیادہ اور پندرہ سو سال سے بھی زیادہ عرصے کا فاصلہ ہوتا ہے۔ وہ صرف شمعون وغیرہ تک پہنچ پاتے ہیں۔

نصاری: رہے نصاریٰ تو ان کے پاس اس میں سے صرف طلاق کی حرمت کا فتویٰ ہے، پھر اس کا بیان کرنے والا بھی ایسا کذاب آدمی ہے، جس کا جھوٹ واضح ہے۔ کذاب اور مجہول راویوں پر مشتمل سندیں یہود و نصاریٰ کے ہاں بہت ہیں۔

رہے اقوال صحابہ و تابعین تو یہودی اپنے نبی کے کسی صحابی یا تابعی تک قطعاً سند نہیں پہنچا سکتے، نہ ہی نصاریٰ کے لیے ممکن ہے کہ وہ شمعون اور پولس سے آگے جائیں۔۔۔“

(الفصل فی الملل والاهواء والنحل: ۸۵-۸۲/۲)



دعا ہو تو ایسی!

حافظ محمد اعجاز ساقی

رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک مہمان آیا، آپ ﷺ نے اپنی تمام ازواج مطہرات کی طرف کھانے کے لیے پیغام بھیجا، لیکن کسی کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہ تھا، اس پر آپ ﷺ نے یہ دعا کی:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ وَرَحْمَتِكَ ، فَانَّهُ لَا یَمْلِكُهُمَا اِلَّا اَنْتَ .

”اے اللہ! میں تجھ سے تیرے فضل اور تیری رحمت کا سوالی ہوں، ان دونوں کا مالک تو ہی ہے۔“

دعا کرنے کی دیر تھی کہ ایک بھنی ہوئی بکری آپ ﷺ کو تھکے میں بھیج دی گئی، آپ ﷺ نے فرمایا، یہ تو اللہ کا فضل ہے، رحمت کے ابھی ہم منتظر ہیں۔ (المعجم الكبير للطبرانی: ۱۷۸/۱۰، وسندہ صحیح)



سوال : کیا امام کی نماز فاسد ہونے سے مقتدی کی نماز فاسد ہو جاتی ہے؟

جواب : اگر امام بے وضو یا جنبی ہو یا اس کے کپڑوں پر نجاست لگی ہو اور اس طرح وہ نماز پڑھادے تو مقتدیوں کی نماز بالکل صحیح اور درست ہے، البتہ امام کے لیے نماز دہرانا ضروری ہے، جیسا کہ:

دلیل نمبر ① : سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يصلّون لكم ، فان أصابوا فلكم ولهم ، وان أخطؤوا فلكم وعليهم .
 ”وہ (حکمران) تمہیں نمازیں پڑھائیں گے، اگر وہ درست پڑھیں گے تو تمہارے لیے بھی ذریعہ نجات ہوگی اور ان کے لیے بھی، لیکن اگر وہ غلطی کریں تو تمہارے لیے ذریعہ نجات اور ان کے خلاف وبال بن جائے گی۔“

(مسند الامام احمد: ۳۵۵/۲، واللفظ له، صحيح بخاری: ۹۶/۱، ح: ۶۹۴)

حافظ بغوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: فیہ دلیل علی أنّہ اذا صلّی بقوم ، وکان جنباً أو محدثاً أنّ صلاۃ القوم صحیحۃ ، وعلی الامام اعادۃ ، سواء کان الامام عالماً بحدثہ متعمداً الامامۃ أو کان جاہلاً ...
 ”اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ امام جب لوگوں کو نماز پڑھائے اور وہ جنبی یا بے وضو ہو تو لوگوں کی نماز صحیح ہوگی، امام پر نماز دہرانا ضروری ہوگا، خواہ اسے اپنے بے وضو ہونے کا علم ہو اور جانتے بوجھتے امامت کروا رہا ہو یا وہ لاعلم ہو۔“ (شرح السنۃ: ۵۰/۳)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

سیأتی أقوام أو یکون أقوام یصلّون الصّلاۃ ، فان أتمّوا فلكم ولهم ، وان نقصوا فلعليهم ولکم .
 ”عنقریب کچھ لوگ (حکمران) آئیں گے، وہ نمازیں پڑھائیں گے، اگر وہ

پوری نماز ادا کریں تو تمہارے لیے بھی کافی اور ان کے لیے بھی، لیکن اگر وہ کوتاہی کریں گے تو ان کے لیے وبال اور تمہارے لیے کافی ہوں گی۔“ (صحیح ابن حبان: ۲۲۲۸، وسندہ حسن)

اس کا راوی عبداللہ بن علی الافریقی ”حسن الحدیث“ ہے۔

۱۔ عباس الدوری کہتے ہیں کہ میں نے امام یحییٰ بن معین سے پوچھا، کیا یہ ثقہ ہے تو آپ نے فرمایا: نعم! لیس بہ بأس۔ ”ہاں! اس میں کوئی خرابی نہیں“ (تاریخ یحییٰ بن معین: ۵۳۳۱)

۲۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: من ثقات أهل الكوفة۔ ”یہ ثقہ کو فیوں میں سے ہے۔“ (صحیح ابن حبان، تحت حدیث: ۲۲۲۲۸)

✽ امام ابو زرعہ الرازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: لیس بالمتین، فی حدیثہ انکار، ہو لین۔

”یہ مضبوط راوی نہیں، اس کی حدیث میں نکارت ہے، یہ کمزور ہے۔“ (الجرح والتعديل: ۱۱۶/۵)

یہ قول جمہور کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول ہے۔

امام ابن المنذر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: هذا الحديث يدل على اغفال من زعم أن

صلاة الامام اذا فسدت فسدت صلاة من خلفه۔ ”یہ حدیث بتاتی ہے کہ وہ شخص

غلطی پر ہے، جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ جب امام کی نماز فاسد ہو جائے تو اس کے مقتدیوں کی نماز بھی فاسد

ہو جائے گی۔“ (الاعتماد في السنن والاجماع والاختلاف لابن المنذر: ۱۶۴/۴)

دلیل نمبر ۵: ابو علی الہمدانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں سفر کے لیے نکلا، ہمارے

ساتھ سیدنا عقبہ بن عامر رحمہ اللہ بھی تھے۔ ہم نے آپ رحمہ اللہ سے کہا، اللہ آپ پر رحم کرے! آپ نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ہیں، آپ ہماری امامت کریں، اس پر آپ رحمہ اللہ نے فرمایا، نہیں، میں نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: من أمّ الناس، فأصاب الوقت وأتم الصلاة فله

ولهم، ومن انتقص من ذلك شيئاً فعليه ولا عليهم۔ ”جو آدمی لوگوں کی امامت کرے،

وقت کو پائے اور کامل نماز پڑھے تو اس کے لیے بھی کافی اور ان کے لیے بھی کافی ہوگی اور جو اس میں کچھ

کوتاہی کرے، اس کے خلاف وبال ہوگی، جبکہ مقتدیوں کے لیے کافی ہوگی۔“ (مسند الامام احمد:

۱۴۵/۴، ۱۵۴، ۱۵۶، ۲۰۱، سنن ابی داؤد: ۵۸۰، سنن ابن ماجہ: ۹۸۳، وسندہ حسن

اس حدیث کو امام ابن خزمیہ رحمۃ اللہ علیہ (۱۵۱۳)، امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ (۲۲۲۱) اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ (۲۱۰/۸) نے ”صحیح“ کہا ہے۔

عبدالرحمن بن حرمہ نے اس روایت میں ابوعلی الہمدانی سے سماع کی تصریح کر رکھی ہے۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی: ۱۲۷/۳)

نیز عبدالرحمن بن حرمہ المدنی جمہور محدثین کے نزدیک ”حسن الحدیث“ ہیں۔

موتقین: ① امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ثقہ، روی عنہ یحییٰ

القطن نحو من مائة حدیث۔ ”یہ ثقہ راوی ہیں، ان سے یحییٰ القطن نے تقریباً سوا حدیث روایت کی ہیں۔“ (الکامل لابن عدی: ۳۱۰/۴، وسندہ صحیح)

② امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لا بأس به۔ ”ان میں کوئی خرابی نہیں۔“

③ ابن نمیر نے ”ثقہ“ کہا ہے۔ (تہذیب التہذیب لابن حجر: ۱۴۷/۶)

④ امام ساجی کہتے ہیں: صدوق، یہم فی الحدیث۔ ”سچے ہیں، حدیث

میں (کبھی) وہم کھاتے ہیں۔“ (تہذیب التہذیب: ۱۴۷/۶)

⑤ امام ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ولم أر فی حدیثہ حدیثا منکرا۔

”میں نے ان کی حدیث میں کوئی منکر حدیث نہیں پائی۔“ (الکامل لابن عدی: ۳۱۷/۴)

⑥ امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں ”الثقات“ میں ذکر کیا اور فرمایا ہے: کان یخطیء۔

”یہ غلطیاں کرتے تھے۔“ امام صاحب کا یہ قول جمہور کی توثیق کے مقابلہ میں ناقابل

الثقات ہے۔ خود امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی حدیث کی ”تصحیح“ کر کے رجوع ثابت کیا ہے۔

⑦ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے یزید بن عبداللہ بن قسیط (ثقہ) اور ابن حرمہ کے بارے میں

پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ما أقربہما۔ ”یہ دونوں کتنے قریب ہیں۔“

⑧ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے متابعتاً روایت لی ہے۔

⑨، ⑩ امام ابن خزمیہ رحمۃ اللہ علیہ (۱۵۱۳) اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ (۲۱۰/۸) نے اس کی حدیث کی ”تصحیح“ کی

ہے۔ یہ ضمنی ”توثیق“ ہے۔ تلك عشرة كاملة ! (یہ پوری دس توثیقات ہیں!)

جارحین : ① امام یحییٰ بن سعید القطان رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ہے کہ:

”فضعفه، ولم يدفعه.“ ”انہوں نے انہیں ضعیف کہا، لیکن بالکل چھوڑا نہیں۔“

(الجرح والتعديل لابن ابی حاتم: ۲۲۳/۵)

اولاً : یہ قول جمہور کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابل التفات ہے۔

ثانیاً : اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کے ثقہ نہیں ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ امام یحییٰ بن

سعید القطان خود فرماتے ہیں: محمد بن عمرو أحب الي من ابن حرملة. ”محمد بن

عمرو بن علقمہ مجھے ابن حرملہ سے زیادہ محبوب ہے۔“ (الجرح والتعديل: ۲۲۳/۵، وسندہ صحیح)

محمد بن عمرو بن علقمہ امام یحییٰ بن سعید القطان کے نزدیک ”ثقہ“ ہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ امام علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: فراددت يحيى في ابن

حرملة، فقال: ليس هو عندى مثل يحيى بن سعيد الانصارى. ”میں نے ابن

حرملہ کے بارے میں امام یحییٰ القطان سے رجوع کیا تو انہوں نے فرمایا، میرے نزدیک وہ یحییٰ بن سعید

انصاری جیسا (بڑا امام) نہیں ہے۔“ (الجرح والتعديل لابن ابی حاتم: ۲۲۳/۵)

ثالثاً : اس قول سے راوی کی عدالت ختم نہیں ہوگی، کیونکہ امام یحییٰ بن سعید القطان خود اس سے

روایات لیتے ہیں، لہذا یہ قول ان کے نزدیک حافظے کے ”ضعف“ پر محمول کریں گے۔

رابعاً : یہ بھی احتمال ہے کہ یہ قول امام یحییٰ بن سعید القطان کے نزدیک منسوخ ہو، دیگر الفاظ

اس کے ناسخ ہوں۔

خامساً : امام یحییٰ بن سعید القطان نقد رجال میں بہت زیادہ سختی سے کام لیتے تھے، جیسا کہ حافظ

ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: كان يحيى بن سعيد متعنّتا في نقد الرجال، فاذا رأيت قد

وثّق شيخاً، فاعتمد عليه، أما إذا لّين أحدا فتأّن في أمره حتى ترى قول غيره فيه،

فقد لّين مثل اسرائيل وهمام وجماعة احتجّ بهم الشّيعان... ”امام یحییٰ بن سعید نقد

رجال میں بہت سخت تھے، جب آپ دیکھیں کہ انہوں نے کسی شیخ نے ثقہ کہا ہے تو ان پر اعتماد کر لیں، لیکن جب وہ کسی کو کمزور قرار دیں تو اس کے بارے میں غور و فکر کریں، حتیٰ کہ اس کے بارے میں دوسرے محدثین کے اقوال دیکھ لیں، کیونکہ انہوں نے اسرائیل، ہمام اور بہت سے ان راویوں کو بھی کمزور قرار دے چھوڑا ہے، جن سے بخاری و مسلم نے حجت لی ہے۔“ (سیر اعلام النبلاء: ۵۵۸/۹)

② امام ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یکتب حدیثہ، ولا یحتج بہ۔

”ان کی حدیث لکھی جائے گی، ان کی حدیث میں کبھی اضطراب بھی ہوتا ہے۔“ (الجرح: ۲۳۳/۵)

کسی راوی کی حدیث میں اضطراب اس کے لیے ضعف کا سبب نہیں، نیز جمہور نے عبدالرحمن بن حرمہ کی روایت کی ”تصحیح“ کر کے ثابت کر دیا ہے کہ یہ مضطرب نہیں ہے، پھر امام ابو حاتم الرازی کی عادت ہے کہ اسی قسم کے الفاظ بخاری و مسلم کے ثقہ راویوں کے متعلق بھی کہہ دیتے ہیں۔

(دیکھیں سیر اعلام النبلاء للذہبی: ۲۶۰/۳)

③ حافظ منذری رحمہ اللہ نے لکھا ہے: لیسہ البخاری۔ ”امام بخاری رحمہ اللہ نے انہیں

کمزور قرار دیا ہے۔“ (الترغیب والترہیب للمندری)

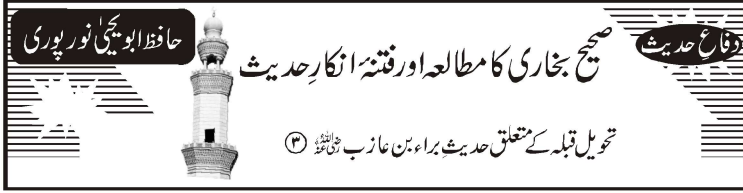
امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ قول عبدالرحمن بن حرمہ الاسلمی کے بارے میں نہیں، بلکہ عبدالرحمن بن حرمہ عم القاسم بن حسان کے بارے میں ہے، لہذا ان پر کلام غیر مؤثر ہے، کیونکہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے انہیں اپنی کتاب من تکلّم فیہ وہو موثق أو صالح الحدیث میں ذکر کیا ہے۔

امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ (م ۳۱۱ھ) اس حدیث پر یوں تبویب کرتے ہیں: والدلیل علی

أن صلاة الامام قد تكون ناقصة وصلاة المأموم تامة، ضد قول من زعم أن صلاة المأموم متصلة بصلاة امامه، اذا فسدت صلاة الامام فسدت صلاة المأموم ...

”یہ حدیث دلیل ہے کہ بسا اوقات امام کی نماز ناقص اور مقتدی کی کامل ہوتی ہے، (یہ حدیث) اس شخص کے خلاف ہے جس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مقتدی کی نماز امام کی نماز کے ساتھ متصل

ہے، اگر امام کی نماز فاسد ہوگی تو مقتدی کی بھی فاسد ہو جائے گی۔۔۔“ (صحیح ابن خزیمہ: ۱۵۱۳)



اعتراض نمبر ④ : قارئین کرام! تحویل قبلہ والی احادیث کی رو سے سورہ

بقرہ کی آیت کریمہ ﴿فَلَنُؤَلِّينَكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (۱۴۴) کا ترجمہ یوں ہوتا ہے کہ ”اے نبی! ہم ضرور آپ کو اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے، جس کو آپ پسند کرتے ہیں، چنانچہ آپ اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں۔“

اس پر اعتراض کرتے ہوئے میرٹھی صاحب کہتے ہیں: ”لیکن یہ مطلب عربیت کے لحاظ سے غلط ہے، اگر قِبْلَةً تَرْضَاهَا سے پہلے لفظ الی یا اور کوئی لفظ جو سمت و جہت کے معنی پر دلالت کرے، ہوتا تو یہ مطلب صحیح ہوتا، توضیح اس کی یہ ہے کہ فعل وَلَّى، یُولِّی کے لغت عرب میں دو معنی آتے ہیں:

① والی و حاکم بنادینا: اس معنی میں اس کا استعمال متعدی بدو مفعول ہوتا ہے اور دونوں منصوب ہوا کرتے ہیں، جیسے وَلَّى السَّلْطَانُ فَلَانًا تِلْكَ الْقَرْیَةَ (سلطان نے فلاں شخص کو اس بستی کا والی بنادیا)

② پھیر دینا: اس معنی میں اس کا استعمال ہو تو وہ چیز جس کی طرف پھیر دینے کا ذکر ہو سمت و جہت پر دلالت کرنے والے کسی لفظ کے ساتھ ذکر کی جاتی ہے، جیسے الی یا نحو یا شطر یا قِبْلَ یا تِلْقَاء جیسے وَلِیْتُ زَيْدًا اِلَى ذَاكَ الْمَكَانِ (میں نے زید کو اس جگہ کی طرف پھیر دیا) اور جس چیز سے پھیر دینے کا ذکر ہو اُسے عَنْ کے ساتھ لایا جاتا ہے، جیسے وَلِیْتُ زَيْدًا عَنْ الشَّمَالِ نَحْوَ الْجَنُوبِ (میں نے زید کو شمال سے جنوب کی طرف پھیر دیا) اس معنی میں اس کا استعمال متعدی بدو مفعول ہو کر نہیں ہوتا۔ لہذا فَلَنُؤَلِّينَكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا کا یہ ترجمہ غلط ہے کہ ہم ضرور ضرور تجھے تیرے پسندیدہ قبلہ کی طرف پھیر دیں گے۔ اس کا صحیح و درست ترجمہ یہ ہے کہ ہم ضرور

ضرورت تھے والی بنادیں گے اس قبلہ کا جسے تو نے (ہمارے حکم سے) اختیار کر رکھا ہے۔۔۔“

(«صحیح بخاری کا مطالعہ»: ۳۵-۴۵/۱)

①: (جواب) یہ اعتراض میرٹھی صاحب کے لغت سے جاہل ہونے کا منہ بولتا

ثبوت ہے، ان کا کہنا ہے کہ وٹلی یوٹی کا معنی پھیرنا ایک شرط کے ساتھ ہوتا ہے، وہ شرط آپ انہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں: ”پھیر دینا، اس معنی میں اس کا استعمال ہو تو وہ چیز جس کی طرف پھیر دینے کا ذکر ہو، سمت و جہت پر دلالت کرنے والے کسی لفظ کے ساتھ ذکر کی جاتی ہے۔۔۔“ («صحیح بخاری کا مطالعہ»: ۳۴/۱)

لیکن میرٹھی صاحب نے لفظ قِبْلَةً پر غور کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اس کا اپنا معنی ہی ”جہت و سمت“ ہے، چنانچہ عربی کی مشہور و معروف اور معتبر لغت تاج العروس وغیرہ میں لکھا ہے:

القبلة في الأصل : الجهة ، يقال : ما لكلامه قبلة ، أي : جهة ...

”قبلہ (سے مراد) دراصل جہت و سمت ہے، کہا جاتا ہے کہ ما لكلامه قبلة (اس کی کلام کا کوئی قبلہ نہیں، یعنی اس کی کوئی سمت نہیں)۔“ (تاج العروس، مادة: قبل)

اب قارئین خود انصاف فرمائیں کہ فعل کے بعد واقع ہونے والی چیز اگر سمت و جہت کے معنی والے کسی لفظ کے ساتھ مل کر آئے تو اس فعل کا معنی ”پھیر دینا“ ہوگا، لیکن اگر اس کا اپنا ذاتی معنی ہی ”سمت و جہت“ ہو تو اس کا معنی ”پھیر دینا“ کیوں نہیں ہوگا؟

خود ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کرو ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی!

اب میرٹھی صاحب کے ہمنوا ہی بتائیں کہ احادیث صحیحہ جو کہ لغت عرب کے عین مطابق ہیں، ان کے مطابق ترجمہ کر کے محدثین و مفسرین نے کون سی غلطی کی ہے، جس کی وجہ سے انہوں نے یہ فتویٰ داغ دیا ہے کہ: ”یہ مطلب عربیت کے لحاظ سے غلط ہے۔“ («صحیح بخاری کا مطالعہ»: ۳۴/۱)

یہ تو معنی و مطلب کی بات ہے، ہمارے گزشتہ مضامین میں تو یہ حقیقت بھی قارئین ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ میرٹھی صاحب کو قرآن کریم (آل عمران: ۱۶۷) میں موجود الفاظ بھی عربیت کے لحاظ سے غلط نظر

آجاتے ہیں۔ (دیکھیں «صحیح بخاری کا مطالعہ»: ۷۳/۸) أَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْ هَذِهِ الْخُرَافَاتِ !
 پھر خود انہوں نے اس آیت کے ترجمہ میں تَرْضَاهَا کا معنی ”جیسے تو نے (ہمارے حکم سے) اختیار رکھا ہے“ کیا ہے، جو کہ واضح طور پر تحریف معنوی ہے، منکرین حدیث بتائیں کہ یہ معنی کس لغت کے اعتبار سے کیا گیا ہے؟ تَرْضَى مضارع کا صیغہ ہے، ماضی کا نہیں کہ اس کا معنی ”اختیار کر رکھا ہے“ کر دیا جائے۔ اصل معنی یہ تھا کہ ”ہم آپ کو ضرور اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے، جسے آپ پسند کرتے ہیں“ جیسا کہ امام ابن جریر رحمہ اللہ کی زبانی بتایا جا چکا ہے، انکار حدیث نے ان کو عقل و نقل دونوں کے خلاف معنی کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

یہ ہے لغت عرب میں میرٹھی صاحب کا مبلغ علم اور ان کو اعتراض ہے امت کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری پر!

② تمام محدثین و مفسرین نے اس آیت کا یہی معنی کیا ہے، میرٹھی صاحب سے پہلے اس ترجمہ کو کسی محدث و مفسر نے غلط قرار نہیں دیا، امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ: (م ۳۱۰ھ) لکھتے ہیں:
 فَأَمَّا قَوْلُهُ: فَلَنُؤَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا، فَانَّهُ يَعْنِي: فَلَنُصَرِّفَنَّكَ عَنْ بَيْتِ الْمَقْدَسِ إِلَى قِبْلَةِ تَرْضَاهَا، تَهْوَاهَا وَتُحِبُّهَا. ”اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ ہم ضرور آپ کو بیت المقدس سے اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے، جس کو آپ پسند کرتے اور چاہتے اور اس سے محبت رکھتے ہیں۔“ (تفسیر طبری: ۱۷۵/۲)

بڑے بڑے لغوی مفسرین نے بھی اس معنی کو غلط قرار نہیں دیا، بلکہ زنجبیری، خازن، بیضاوی، ثعلبی، رازی وغیرہ جو کہ لغت عرب کے ماہرین ہیں، سب کے بیک زبان اس معنی کو صحیح قرار دیا ہے۔
 اب سوال ہے کہ کیا قریباً چودہ سو سال تک مسلمان لغت عرب سے جاہل رہے، کسی کو بھی اس کی سمجھ نہ آسکی، مسلمانوں کے اسلاف کے بارے میں ایسے نظریات رکھنے والا شخص بھلا کیسا مسلمان ہوگا؟
اعتراض نمبر ۸: سنن ابن ماجہ کی روایت پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”یہ روایت غلط بیانیوں اور فضول باتوں کی بے ہودہ معجون ہے اور اس کی دلیل ہے کہ عموماً رایان

حدیث عقل فہم سے بے بہرہ تھے، نقل کرنے کے لیے عقل کی ضرورت کے قائل نہ تھے۔۔۔ یہ بات نقل کرتے ہوئے نہ ابن ماجہ نے کچھ عقل سے کام لیا، نہ ان کے شیخ علقمہ بن عمرو دارمی نے، نہ ان کے شیخ ابوبکر بن عیاش نے۔۔۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ) : (۳۷۸-۳۸)

(جواب): قارئین کرام! صحیح بخاری پر اعتراضات کے ضمن میں سنن ابن ماجہ کی ایک ”ضعیف“ روایت کو نشانہ بنا کر ائمہ دین، محدثین اور تمام راویان حدیث کو عقل سے بے بہرہ قرار دینا انتہائی فضول بکواس، بے وقوفی کی معراج اور انصاف کا خون کرنے والی بات ہے، میرٹھی صاحب کی عقل نے اتنا بھی کام نہیں کیا کہ سنن ابن ماجہ کی اس ”ضعیف“ روایت کا صحیح بخاری پر اعتراضات سے کیا تعلق ہے؟ اس روایت کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے شاذ (ضعیف) قرار دیا ہے۔

(فتح الباری لابن حجر: ۹۷/۸)

پھر ہم گزشتہ تحقیق سے یہ بات ثابت کر آئے ہیں کہ امام ابواسحاق السبئی آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے اور اختلاط سے پہلے ان سے ان کے صرف تین شاگردوں امام سفیان ثوری، امام شعبہ اور اسرائیل رحمہم کا سماع ثابت ہے۔

اصول حدیث کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ ایسے راوی کی صرف وہ احادیث ”صحیح“ ہوں گی، جو اس سے اختلاط سے پہلے سننے والے شاگرد بیان کریں، جب کہ معلوم ہے کہ ابوبکر بن عیاش کا ابواسحاق سے قبل الاختلاط سننا ثابت نہیں ہے، لہذا یہ روایت ”ضعیف“ ہے۔

محدثین، جو کہ حقیقی طور پر اولیاء اللہ ہیں، ان کے خلاف اس ”شاذ“ روایت کو بنیاد بنا کر جو منکر حدیث صاحب نے ہرزہ سرائی کی ہے، ہمیں اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں، اس کا شکوہ ہم اللہ ہی سے کرتے ہیں:

الہی! تو جانتا ہے کہ تیرے دین کے ان محافظ محدثین سے ہمیں کتنی محبت ہے! ہم سے ان کے خلاف ایسی بکواسات برداشت نہیں ہو پاتیں! اگر تیرے علم کے مطابق ان منکرین حدیث کی قسمت میں ہدایت نہیں تو تو ان کی ایسی بکواسات پر خود ان سے نمٹ لے!

انکار حدیث سے انکار قرآن تک

قارئین کرام! ہم پہلے بھی یہ بات بتا چکے ہیں کہ انکار حدیث دراصل انکار قرآن ہے، اس کی کئی مثالیں آپ میرٹھی صاحب کی کلام سے ملاحظہ فرما چکے ہیں، ان کی طرف سے انکار قرآن کی ایک اور مثال پیش خدمت ہے، لکھتے ہیں:

”پھر اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہوئے اپنے چہرے کو آسمان میں بہت اٹتے پلٹتے رہتے تھے، کیا یہ ممکن ہے کہ زمین پر کھڑا بیٹھا ہو کوئی انسان خواہ وہ اللہ کا نبی ہی کیوں نہ ہو، آسمان میں اپنا چہرہ اٹے پلٹے؟“

(«صحیح بخاری کا مطالعہ»: ۳۸/۱)

میرٹھی صاحب کا یہ اعتراض حدیث پر نہیں، بلکہ قرآن کریم پر ہے، کیونکہ ہم بتا چکے ہیں کہ اصول محدثین کے مطابق یہ روایت ثابت ہی نہیں، البتہ منکرین حدیث نے اس پر اعتراض کر کے اپنی عقبی خراب کر لی ہے، وہ اس طرح کہ بالکل یہی بات قرآن کریم میں موجود ہے، پہلے آپ اس روایت کے الفاظ پڑھیں:

وَكَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا صَلَّى إِلَى بَيْتِ الْمَقْدَسِ أَكْثَرَ تَقَلُّبَ وَجْهِهِ فِي السَّمَاءِ ..

یہ الفاظ ہم نے میرٹھی صاحب کی کتاب سے ہی نقل کیے ہیں۔

دیکھیں («صحیح بخاری کا مطالعہ»: ۳۶-۳۷/۱)

جبکہ محض ضمیر غائب کی جگہ پر مخاطب کی ضمیر کے فرق کے ساتھ یہ الفاظ قرآن کریم میں بھی موجود ہیں، فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ﴾ (البقرة: ۱۴۴)

سچ کہتے ہیں کہ چاند پر تھوکنے والا چاند کا کچھ نہیں بگاڑتا، بلکہ وہ تھوک خود اس کے منہ پر گرتا ہے، لہذا جو اعتراض جناب نے بے وقوفی کی وجہ سے حدیث پر کرنے کی کوشش کی تھی، وہ خود قرآن کریم کی گستاخی ثابت ہو کر تاقیامت ان کی جہالت و بے وقوفی پر مہر ثبت ہو گیا ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں سے یہ الفاظ میرٹھی صاحب اپنی کتاب میں بار بار پیش کر چکے ہیں، لیکن حدیث پر اعتراض کرتے ہوئے ان کے دماغ نے کام چھوڑ دیا تھا۔

اعتراض نمبر ۹: تفسیر ابن کثیر میں موجود امام محمد بن اسحاق کی روایت نقل

کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ”اس روایت میں یہ ہرزہ سرایاں کی گئی ہیں:

① تَقَلَّبَ وَجْهَہ کا معنی بکثرت دیکھنا اور فِی السَّمَاءِ کو اِلٰی السَّمَاءِ کے معنی میں بتایا ہے اور نہایت افسوس کی بات ہے کہ مترجمین نے ابنِ اسحق کی روایت کے مطابق ہی آیت شریفہ کا غلط ترجمہ کر ڈالا اور وہی ترجمہ و مطلب لوگوں میں معروف ہو چکا ہے۔ آیت شریفہ قَدْ نَرٰی تَقَلَّبَ وَجْهَہَکَ فِی السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبْلَۃً تَرْضٰہَا کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے:

(اے نبی! ہم تیرے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں، پس ہم یقیناً تجھے اسی قبلہ کی طرف متوجہ کر دیں گے جسے تو پسند کرتا ہے)

اس ترجمہ میں تین فاش و صریح غلطیاں ہیں، اول یہ کہ تَقَلَّبَ وَجْهَہ کے معنی نہ بکثرت دیکھنا ہیں، نہ چہرہ اوپر اٹھانا۔ منثور و منظوم کلام عرب سے تَقَلَّبَ وَجْهَہ کے اس معنی کا سراغ نہیں لگ سکتا، تَقَلَّبَ وَجْهَہ کے یہ معنی بتانا اتنا ہی غلط ہے، جتنا یہ غلط ہے کہ کوئی شخص اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے معنی یہ بتائے کہ حضرت نوح کی عمر پندرہ سو سال ہوئی تھی۔ لغت عرب میں تَقَلَّبَ اللُّنۃُ پلٹنے اور کروٹ بدلنے کے معنی میں ہے اور تَقَلَّبَ وَجْهَہ (چہرے کا الٹنا پلٹنا) کنایہ ہے بے چینی اور قلق و اضطراب سے۔

دوم یہ کہ فِی السَّمَاءِ کا صحیح ترجمہ ہے ”آسمان میں“ اس کا ترجمہ ”آسمان کی طرف“ کرنا قطعاً غلط ہے، یہ ترجمہ اِلٰی السَّمَاءِ کا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ آیت شریفہ میں اِلٰی السَّمَاءِ نہیں، بلکہ فِی السَّمَاءِ ہے، نیز مترجمین نے فِی السَّمَاءِ کو تَقَلَّبَ سے متعلق سمجھ لیا ہے، حالانکہ اس کا تعلق فعل نَرٰی سے ہے، سوم یہ کہ فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبْلَۃً کا ترجمہ یہ کرنا کہ ”ہم یقیناً تجھے قبلہ کی طرف متوجہ کر دیں گے“ غلط ہے۔۔۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ ۴۱/۴۰: ۴۱)

(جواب): ① یہ روایت صحیح بخاری میں موجود ہی نہیں، خود میرٹھی صاحب نے اسے تفسیر ابن کثیر کے حوالے سے بیان کیا ہے، کیا کسی نے آج تک یہ دعویٰ کیا ہے کہ تفسیر ابن کثیر کی تمام احادیث صحیح ہیں؟ اگر میرٹھی صاحب اپنی کتاب کے ٹائٹل کو ہی غور سے دیکھ لیتے تو شاید ایسا نہ کرتے!

اب قارئین ہی بتائیں کہ ان کی اس بے اصولی کو فضول ورق کالے کرنے کے سوا کیا نام دیا جائے؟ لہذا اس روایت پر ان کے فضول و بے کار اعتراضات کا جواب دے کر ہم اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے۔

② رہا آیت کریمہ کے ترجمہ پر اعتراض تو عرض ہے کہ یہ ترجمہ اس حدیث کی وجہ سے نہیں، بلکہ دوسری صحیح احادیث اور لغت عرب کی بنا پر کیا گیا ہے، آئیے عربی دان لوگوں کی زبانی اس کی وضاحت کرتے ہیں:

امام قتادہ بن دعامة تابعی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: کان صلی اللہ علیہ وسلم یقلّب وجهہ فی السماء، یحبّ أن یصرّفہ اللہ عزّ وجلّ الی الکعبۃ، حتی صرّفہ اللہ الیہا۔ ”نبی کریم ﷺ اپنے چہرہ مبارک کو آسمان کی طرف پھیرتے تھے، خواہش یہ فرماتے کہ اللہ تعالیٰ ان کا قبلہ کعبہ کی طرف پھیر دے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس کعبہ کی طرف پھیر دیا۔“ (تفسیر طبری: ۱۷۲/۳، وسندہ صحیح)

یاد رہے کہ امام قتادہ رحمہ اللہ وہ عظیم تابعی ہیں، جن کے بارے میں امام اہل سنت احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عالم بتفسیر القرآن۔ ”آپ رحمہ اللہ تفسیر قرآن کے عالم تھے۔“ (الجرح والتعديل لابن ابی حاتم: ۱۳۴/۷)

امام طبری رحمہ اللہ کے بارے میں مؤرخ اسلام حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: کان ثقة، صادقاً، حافظاً، رأساً فی التفسیر، اماماً فی الفقہ، والاجماع والخلاف، علامة فی التاريخ وأيام الناس، عارفاً بالقراءات وباللغة وغير ذلك.. ”آپ (امام ابن جریر) رحمہ اللہ ثقہ، صادق اور حافظ تھے، نیز تفسیر، فقہ، اجماع اور اختلاف کے امام تھے، تاریخ اور لوگوں کے ایام (جنگوں) کے علامہ، قراءات اور لغت وغیرہ کے ماہر تھے۔“

(سیر اعلام النبلاء: ۲۷۷/۴)

لغت کے یہ ماہر امام اور مفسر قرآن لکھتے ہیں:

يعنى بالتَّغْلِبِ : التَّحَوُّلُ وَالتَّصَرُّفُ ، ويعنى بقوله : فى السَّمَاءِ : نحو السَّمَاءِ وَقِبَلَهَا ... ”تَغْلِبُ سَمَاءُ“ (چہرے کو) پھیرنا اور تبدیل کرنا ہے اور فرمانِ باری تعالیٰ فى السَّمَاءِ سے مراد آسمان کی جہت اور طرف ہے۔“ (تفسیر طبری: ۱۷۲/۳)

علامہ زحشری (م ۵۳۸ھ) لکھتے ہیں: تَغْلِبُ وَجْهَكَ : تَرَدُّدٌ وَجْهَكَ وَتَصَرُّفٌ نَظْرَكَ فى جِهَةِ السَّمَاءِ ، وَكَانَ يَتَوَقَّعُ مِنْ رَبِّهِ أَنْ يَحْوِلَهُ إِلَى الْكَعْبَةِ ... ”تَغْلِبُ وَجْهَكَ“ کا معنی آپ کا اپنے چہرہ مبارک اور اپنی نظر مبارک کو آسمان کی طرف پھیرنا ہے، آپ ﷺ اپنے رب تعالیٰ سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ ان کا قبلہ کعبہ کی طرف پھیر دے گا۔“ (الکشاف: ۲۲۸/۱)

یہ علامہ زحشری وہ ہیں، جن کے بارے میں ناقدِ رجال حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وَكَانَ رَأْسًا فى الْبَلَاغَةِ وَالْعَرَبِيَّةِ وَالْمَعَانِي وَالْبَيَانِ ، وَلَهُ نَظْمٌ جَيِّدٌ . ”آپ بلاغت، عربیت، علم معانی و بیان میں ماہر تھے، آپ کے بڑے عمدہ اشعار بھی ہیں۔“ (سير اعلام النبلاء للذهبي: ۱۵۴/۲۰)

علامہ بیضاوی لکھتے ہیں: تَغْلِبُ وَجْهَكَ فى السَّمَاءِ : تَرَدُّدٌ وَجْهَكَ فى جِهَةِ السَّمَاءِ تَطَلُّعًا لِلْوَحَى ... ”اس سے مراد آپ ﷺ کا وحی کے انتظار میں اپنے چہرے کو آسمان کی طرف بار بار پھیرنا ہے۔“ (تفسير البيضاوى: ۴۲۰/۱)

اگر ہم اس آیت کی تفسیر میں تمام مفسرین کے اقوال پیش کرنا شروع کر دیں تو ایک مستقل کتاب بن جائے، ہم صرف ان چند حوالہ جات پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

قارئینِ کرام! تابعینِ کرام اور مفسرینِ قرآن کیا لغتِ عرب سے ناواقف تھے؟ امام قتادہ جو کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک مفسرِ قرآن ہیں، وہ یہی ترجمہ کر رہے ہیں، امام ابن جریر رحمہ اللہ بقول حافظ ذہبی رحمہ اللہ عربی دان ہیں، وہ یہی معنی کر رہے ہیں، علامہ زحشری جو حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے ہاں لغتِ عرب کے ماہر، فصیحِ بلیغ اور بہترین عربی شاعر بھی ہیں، اس معنی کو صحیح قرار دیتے ہیں، علامہ بیضاوی جو کہ عربی لغت و معانی کے امام سمجھے جاتے ہیں، یہ تفسیر کر رہے ہیں، نیز آج تک آنے والے

تمام مسلمان مفسرین اس معنی کو صحیح قرار دیتے آئے ہیں، کسی نے اسے لغوی یا عقلی اعتبار سے غلط قرار نہیں دیا، کیا وہ سب جاہل تھے؟

اب آپ خود ہی اندازہ کر لیں کہ میرٹھی صاحب کا یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ ”منثور و منظوم کلام عرب سے تقلّب وجہ کے اس معنی کا سراغ نہیں لگ سکتا۔“

خود میرٹھی صاحب کا ”فرمان“ ہے کہ ”لغت عرب میں تقلّب اللّٰث پلٹنے اور کروٹ بدلنے کے معنی میں ہے۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ: ۴۷۱)

پھر عربی لغت میں وَجْہ کا معنی چہرہ ہوتا ہے، جس سے کسی منکر حدیث کو انکار نہیں۔ لیکن نہ جانے اس ”اللّٰث پلٹنے“ کے ساتھ جب وَجْہ (چہرے) کا لفظ حدیث میں آگیا تو اس کا معنی ”چہرے کو الٹنا پلٹنا“ کیوں صحیح نہیں رہا؟

② تمام سلف صالحین اور ساری امت مسلمہ کے متفقہ فہم قرآن کو غلط قرار دیتے ہوئے جو معنی میرٹھی صاحب نے کیا ہے کہ یہ ”کنایہ ہے بے چینی اور قلق و اضطراب سے۔۔۔“ تو اس سے کسی کو کوئی بھی اختلاف نہیں، ظاہر ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ قبلہ تبدیل ہونے کی خواہش میں اپنے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتا رہے تھے تو اس وقت آپ بے چین اور قلق و اضطراب میں ہی تھے۔

③ ہمارا منکر ترین حدیث سے سوال ہے کہ انہوں نے اپنے کیے گئے معنی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کوئی منثور و منظوم کلام کیوں پیش نہیں کی؟ میرٹھی صاحب تو اللہ کی عدالت میں پہنچ چکے، اب ان کا کوئی فیض یافتہ ہی ان کی اس بات کا ثبوت قدیم عربوں کی منثور و منظوم کلام سے پیش کرے کہ وہ تقلّب وجہ کے ”چہرے کو الٹنے پلٹنے“ والے معنی کو غلط کہتے ہوں اور اسے صرف قلق و اضطراب سے کنایہ قرار دیتے ہوں!

④ میرٹھی صاحب کہتے ہیں کہ ”فی السّماء کا صحیح ترجمہ ہے آسمان میں، اس کا ترجمہ آسمان کی طرف کرنا قطعاً غلط ہے۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ: ۴۷۱)

لیکن یقین جانے کہ میرٹھی صاحب کی یہ بات ان کی اپنی جہالت اور قطعاً غلط ہے، کیونکہ لغت

عرب میں فِی کو الی کے معنی میں استعمال کیا جانا معروف ہے، جیسا کہ عربی لغت کی مشہور و معروف کتاب تاج العروس میں لکھا ہے کہ فِی کو الی کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

(تاج العروس: ۲۶۴/۳۹)

عربی ادب و لغت کے امام اور ناقد، ابن قتیبہ دینوری (م ۲۷۶ھ) یہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بعض حروف دوسرے حروف کے معانی میں استعمال ہو جاتے ہیں: و (فی) مکان (الی)

”اور فِی کو الی کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔۔۔“ (ادب الکاتب: ۳۹۹/۱)

ابن قتیبہ تمام امت مسلمہ کے ہاں مسلم لغوی اور ادیب تھے، ان کے بارے میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: النحوی اللغوی صاحب المصنّفات البديعة المفيدة المحتوية على علوم جمّة نافعة... ”آپ نحوی اور لغوی تھے، تمام مفید علوم کے بارے میں آپ کی مفید، بے مثال اور جامع تصنیفات موجود ہیں۔“ (البدایة والنهاية لابن کثیر: ۶۵/۱)

اسی طرح نحو اور لغت کی دوسری کتب مثلاً أوضح المسالک، شرح الرضی علی الکافیہ اور مغنی اللیب وغیرہ میں یہ بات لکھی ہوئی ہے، لیکن کریں کیا کہ ہمیں ایسے منکرین حدیث سے پالا پڑا ہے، جو لغت و ادب عربی سے یکسر جاہل ہیں۔ صحیح بخاری پر اعتراضات کرنے سے پہلے منکرین حدیث کو کم از کم لغت اور دوسرے ضروری عربی فنون پر تو مہارت حاصل کر لینی چاہیے! یہ حالت ہے میرٹھی صاحب کی جہالت مطلقہ کی اور وہ کیسے بے باکی سے سلف صالحین کے ترجمے پر ”غلط سلط“ کا فتویٰ لگا رہے ہیں۔

⑥ جب یہ ثابت ہو گیا کہ فِی ، الی کے معنی میں مستعمل ہے تو میرٹھی صاحب کا یہ اعتراض بالکل باطل ہو گیا کہ ”مترجمین نے فی السماء کو تقلّب کے متعلق سمجھ لیا ہے، حالانکہ اس کا تعلق فعل نری سے ہے۔“ کیونکہ اس صورت میں نری سے اس کا تعلق بن ہی نہیں سکتا۔ اگر بنائیں تو معنی یوں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”ہم آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔“ جو کہ صریح طور پر غلط ہے۔

④ فَلَنُؤَلِّقَنَّكَ قَبْلَةً تَرْضَاهَا کے ترجمے پر تبصرہ اعتراض نمبر ④ کے تحت گزر چکا ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے سے ہر ذی شعور شخص میرٹھی صاحب کی صداقت و دیانت سے واقف ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ !

معلوم ہوا کہ آیت کریمہ کے صحیح ترجمے میں میرٹھی صاحب کی لگائی گئی تینوں ”فاش و صریح غلطیاں“ دراصل ان کی اپنی فاش و صریح غلطیاں ہیں اور ان کے لغت عرب کی ابجد سے بھی ناواقف ہونے کی واضح دلیل ہیں۔ اسے ہی کہتے ہیں ”چور بھی کہے چور چور۔“
ع الزام ہم کو دیتے تھے، قصور اپنا نکل آیا۔

خیانتوں اور جہالتوں کا اتوار بازار

اعتراض نمبر ⑤ : صحیح بخاری میں موجود امام سفیان ثوری کی حدیث کا ترجمہ کرتے ہوئے میرٹھی صاحب لکھتے ہیں: ”ہم سے ابو اسحاق سمیع نے بیان کیا کہ میں نے براء بن عازب سے سنا کہ ہم (یعنی انصارِ مدینہ) نے نبی ﷺ کے ساتھ یعنی آپ کی موجودگی میں ۱۶ یا ۱۷ ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی، پھر اللہ نے آپ کو اصل قبلہ کی طرف پھیر دیا، یعنی حتماً حکم دے دیا کہ کعبہ رخ ہو کر نماز پڑھی جائے۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے ابو اسحاق سمیع سے حدیثیں ان کے ہوش و حواس اور حفظ و ضبط میں فتور آنے سے قبل سنی ہیں، لہذا یہ حدیث صحیح و قابل اعتماد ہے اور اس وہ فضولیات اور اٹلی سیدھی غلط سلت باتیں نہیں ہیں، جو ابو اسحاق کے ان تلامذہ کی روایات میں ہیں، جنہوں نے ابو اسحاق سے یہ حدیث ان کے مجبوظ الحواس ہونے کے زمانہ میں سنی تھیں اور سفیان ثوری کی اس روایت میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا یہ جو قول مذکور ہے کہ ہم نے نبی ﷺ کے ساتھ ۱۶ یا ۱۷ ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ خود حضور اکرم ﷺ نے بھی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے مدینہ میں نماز پڑھی تھی، بلکہ یہ عمل مدینہ میں رہنے والے انصاری مسلمانوں کا تھا، بیعت عقبہ اولیٰ کے موقع پر اہل مدینہ میں سے جو سات حضرات مشرف بہ اسلام ہوئے تھے، ان کی گزارش کے مطابق آپ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ معتمد و مبلغ

کی حیثیت سے بھیج دیا تھا، انہوں نے یثرب پہنچ کر بڑی تندہی و جاں فشانی کے ساتھ تبلیغ حق فرمائی، ان کی اور نو مسلم انصار کی کوششیں بڑی مبارک و ثمر آور ہوئیں اور ایک سال کے اندر مدینہ کے ایک ایک گھر میں اسلام ایک محبوب و پسندیدہ دین کی حیثیت سے داخل ہو گیا، مدینہ کے ان مسلمان ہو جانے والے اشخاص کو حضرت مصعب نے نماز اور اس کے اوقات کی تعلیم دی تھی، لیکن وہ اس حکم سے واقف نہ تھے کہ نماز کعبہ رخ ہی پڑھنی چاہیے، ان حضرات نے اسلام اور یہود کے دین کو یکساں ہی خیال کیا تھا، کیونکہ یہود بھی بت پرستی نہ کرتے تھے اور ان میں سے جو لوگ نماز پڑھتے تھے، بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھتے تھے، انصاری مسلمانوں نے بھی یہود کی دیکھا دیکھی بیت المقدس کو ہی قبلہ قرار دے لیا تھا۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ: ۴۳/۸-۴۴)

(جواب: ①) ہم گزشتہ قسطوں میں یہ بیان اتنی وضاحت و تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں کہ جس سے ہر ذی شعور شخص سمجھ سکتا ہے کہ امام سفیان ثوری کی طرح امام شعبہ اور امام اسراہیل بن یونس نے بھی امام ابواسحاق السبعی سے قبل الاختلاط روایات سنی ہیں، جو کہ بالاتفاق صحیح ہوتی ہیں اور اسراہیل بن یونس نے وہ الفاظ بیان کیے ہیں، جن کو میرٹھی صاحب ”فضولیات اور اٹلی سیدھی غلط سلت باتیں“ قرار دے رہے ہیں، لہذا منکرین حدیث کو میرٹھی صاحب کی بات ماننے کی بجائے ان کی جہالت پر افسوس کرنا چاہیے!

② اس حدیث کے ترجمہ میں میرٹھی صاحب نے تحریف معنوی کا عالمی ریکارڈ توڑنے کی کوشش کی ہے، کیونکہ صلیٰ اللہ علیہ وسلم ... کا ترجمہ یہ کرنا کہ ”ہم نے آپ کی موجودگی میں نمازیں پڑھیں۔۔۔“ اور پھر کہنا کہ ”اس کا مطلب یہ نہیں کہ خود حضور اکرم ﷺ نے بھی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے مدینہ میں نماز پڑھی تھی، بلکہ یہ عمل مدینہ میں رہنے والے انصاری مسلمانوں کا تھا۔“

اسی طرح غلط ہے جس طرح کوئی صحیح بخاری کی ہی حدیث (۱۰۸۱) خرجنا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من المدینة الى مكة ... (سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم

ﷺ کے ساتھ مدینہ سے مکہ کی طرف نکلے) اس کا یہ ترجمہ کرے کہ ”ہم نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں مدینہ سے مکہ کی طرف نکلے۔“ اور پھر وہ کہہ دے کہ ”اس کا یہ مطلب نہیں کہ خود حضور اکرم ﷺ بھی مدینہ کی طرف نکلے تھے، بلکہ یہ عمل مدینہ میں رہنے والے مسلمانوں کا تھا۔“

نیز میرٹھی صاحب کے معتقدین سے ہمارا سوال ہے کہ کیا سیدنا براء بن عازب اور دوسرے تمام مدنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کے خلاف نمازیں ادا کرتے رہے؟ اَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْ هَذِهِ السَّفَوَاتِ! کسی قرینے و دلیل کے بغیر میرٹھی صاحب کا یہ معنی کیسے صحیح ہو سکتا ہے، جبکہ امت مسلمہ کا اجماع بھی اس کو باطل قرار دے رہا ہے؟

③ اس حدیث کے ترجمہ میں تحریف معنوی کا دوسرا شاہکار میرٹھی صاحب کا یہ ترجمہ ہے کہ ”پھر اللہ نے آپ کو اصل قبلہ، یعنی خانہ کعبہ کی طرف پھیر دیا، یعنی حتماً حکم دے دیا کہ کعبہ رخ ہو کر نماز پڑھی جائے۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ: ۴۳/۸)

میرٹھی صاحب کے ہمنوا ہمیں بتائیں ثُمَّ صَرَّفَهُ نَحْوَ الْقِبْلَةِ ... کا اجماع امت کے خلاف ”حتماً حکم دے دیا“ والے ترجمہ کا سراغ عربی کی کس منشور و منظوم کلام یا لغت سے لگتا ہے؟ اس کا واضح اور صاف معنی وہی ہے جو ساری امت چودہ سو سالوں سے کرتی چلی آرہی ہے کہ: ”پھر آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے (بیت المقدس سے) خانہ کعبہ کی طرف پھیر دیا (یعنی آپ کا قبلہ بدل دیا)۔“

اس کی سند پر چونکہ میرٹھی صاحب کوئی کلام نہیں کر پائے تھے، لہذا انہوں نے اس طرح کی جاہلانہ، فضول اور بے بنی و اہیات کے ذریعہ جان بچانے کی کوشش کی ہے۔

صحیح مسلم میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث، جس پر میرٹھی صاحب کوئی اعتراض نہیں کر پائے ہیں، اس میں موجود الفاظ میرٹھی کمپنی کے منہ پر زور دار طمانچہ ہیں کہ:

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَصَلِّيْ نَحْوَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ ، فَنَزَلَتْ .. ”رسول اللہ ﷺ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے، پھر یہ (تحويل قبلہ والی)

آیت نازل ہوگئی۔۔۔“ (صحیح مسلم: ۵۲۷)

⑤ میرٹھی صاحب کے بقول رسول اللہ ﷺ کے مدینہ بھیجے ہوئے صحابی سیدنا مصعب بن عمیر اور دوسرے مدنی صحابہ اس حکم سے واقف نہ تھے کہ نماز کعبہ رخ ہی پڑھنی چاہیے، ان حضرات نے اسلام اور یہود کے دین کو یکساں ہی خیال کیا تھا، میرٹھی صاحب کی اس بات کو صحیح سمجھ لینا کتنی بڑی جسارت اور ڈھٹائی کی بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ والوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایسے صحابی کو بھیج دیا، جسے نماز کے قبلہ کا بھی علم نہیں تھا۔

نیز یہ کتنا احمقانہ کلمہ ہے کہ صحابہ کرام نے دین اسلام اور دین یہود کو یکساں خیال کر لیا تھا، کیا منکرین حدیث کے نزدیک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بلا سوچے سمجھے مسلمان ہو گئے تھے؟ پھر یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے کہ اسلام اور دین یہود ملتا جلتا تھا، اس کا اندازہ صحیح مسلم وغیرہ کی اس حدیث سے ہو سکتا ہے، سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ یہودی اپنی بیویوں کو ایام ماہواری میں اپنے گھروں سے باہر نکال دیتے تھے اور ان کے ساتھ کھانے پینے کو جائز نہیں سمجھتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمان جاری کیا کہ سوائے جماع کے ان کے ساتھ ہر طرح کا تعلق ان ایام میں روا ہے تو یہود نے کہا: ”ما یرید هذا الرجل أن یدع من أمرنا شیئاً الا خالفنا فیہ ...“ ”یہ شخص (نبی کریم ﷺ) تو صرف ہر معاملے میں ہماری مخالفت کرنا چاہتا ہے۔“ (صحیح مسلم: ۳۰۲)

یہود تو پکار پکار کر یہ کہیں کہ رسول کریم ﷺ ہر معاملے میں ان کی مخالفت کرتے ہیں اور میرٹھی صاحب آپ ﷺ کے جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ حکم لگائیں کہ انہیں اسلام اور دین یہود یکساں لگتے تھے، اس لیے انہوں نے قبلہ ہی یہود کا اپنا لیا تھا، یہ یا وہ گوئی اور بے وقوفی کی انتہا ہے!

اعتراض نمبر ⑪: ”آپ نے اوائل ہجرت میں مقام قبائیں قیام کے زمانہ میں مسجد بنوائی تو وہ کعبہ رخ ہی تھی، جیسے دنیا بھر کی تمام مسجدیں کعبہ رخ ہوتی ہیں۔ پھر آپ مدینہ تشریف لے گئے تو چند روز بعد آپ نے وہ مسجد بنوائی جسے مسجد نبوی کہا جاتا ہے، وہ بھی اول روز سے کعبہ رخ ہی رہی ہے۔۔۔ اب ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس زمانہ میں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے

ہوتے تو یہ دونوں مسجدیں بیت المقدس کے رخ پر تعمیر کی جاتیں، یعنی ان کی دیوارِ قبلہ سمتِ شمال ہوتی، پھر تحویل قبلہ کا حکم آ جانے پر وہ منہدم کی جاتی اور سمتِ جنوب تعمیر کی جاتی اور ایسا ہوا ہوتا تو ضرور منقول ہوتا، کیونکہ مسجدِ نبوی کے تمام تعمیری تغیرات آغازِ بنا سے لے کر آج تک بطریق متواتر منقول ہوتے چلے آئے ہیں۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ: ۴۵-۴۴)

جواب: ① منکرینِ حدیث اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکے کہ مسجدِ قبا اور مسجدِ نبوی میں پہلے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی جاتی تھی تو شمال والی دیوار کی طرف رخ کیا جاتا تھا اور پھر جب قبلہ خانہ کعبہ کی طرف تبدیل ہو گیا تو جنوب والی دیوار کی طرف رخ کیا جانے لگا۔ ان مسجدوں میں کون سے محراب یا مینار بنائے گئے تھے کہ جس سے کوئی دیوارِ قبلہ متعین ہوتی اور پھر اسے تبدیل کرنا پڑتا؟

② پھر میرٹھی صاحب نے مسجدِ نبوی کے تمام تعمیری تغیرات کا بطریق متواتر منقول ہونا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر دیوارِ قبلہ منہدم کر کے دوبارہ تعمیر کی گئی ہوتی تو یہ بات ضرور منقول ہوتی۔ ان کے معتقدین سے ہمارا سوال ہے کہ کیا تحویل قبلہ کے حق ہونے کے بارے میں امتِ مسلمہ کا چودہ سو سالہ تواتر ان کو نظر نہیں آیا جسے سب مفسرین و محدثین نقل کرتے آئے ہیں؟

یہ عجیب منطق ہے کہ جو چیز تواتر سے منقول ہے، اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں اور منہدم کر کے دیواریں دوبارہ بنانا، جس کا ہم نے دعویٰ ہی نہیں کیا، اس پر تواتر کی دلیل کا مطالبہ کیا جا رہا ہے!

قارئینِ کرام ہی بتائیں کہ یہ کس عدالت کا انصاف ہے؟

الحمد للہ! ہم نے قرآن، حدیث، عربی لغت و ادب اور عقل و فہم ہر طرح سے نبی کریم ﷺ کا پہلے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا اور تحویل قبلہ کے بعد خانہ کعبہ کی طرف رخ کرنا ثابت کر دیا ہے۔ لغتِ عرب، حدیث، اصولِ حدیث اور تفسیر سے اتنی جہالت کے باوجود میرٹھی صاحب کی دعوت ہے کہ ”آیاتِ قبلہ کے صحیح تفسیر جاننے کے لیے ہر پڑھے لکھے شخص کو تفسیرِ مفتاح القرآن کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے، اس میں تحویل قبلہ کے متعلق سیر حاصل کلام کیا گیا ہے۔“ (مطالعہ: ۴۶)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو صراطِ مستقیم پر گامزن فرمادے! آمین

اہل سنت کون؟

حافظ ابوبیخیٰ نورپوری

امام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ (۱۱۱۵-۱۲۰۶ھ) اہل سنت والجماعت کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے اور اسی کو اپنا عقیدہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ”میں اللہ کو، اپنے پاس موجود فرشتوں کو اور آپ کو گواہ بنا کر گواہی دیتا ہوں کہ میرا وہی عقیدہ ہے، جو اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، موت کے بعد جی اٹھنے اور اچھی بری تقدیر پر ایمان کے بارے میں اہل سنت والجماعت عقیدہ رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان سے مراد اس کی ان تمام صفات پر بغیر تحریف و تعطیل ایمان لانا ہے، جو اس نے اپنے لیے اپنی کتاب میں اور اپنے نبی ﷺ کی زبان سے بیان کی ہیں، میں یہ اعتقاد رکھتا ہوں کہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں، جیسا کہ اس نے فرمایا ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوریٰ: ۱۷/۴۲) (اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہ سب سے بصیر ہے)، میں اس کی بیان کردہ کسی صفت کا انکار نہیں کرتا، نہ میں اس کے کلمات کو (تاویل باطل کر کے) ان کی جگہ سے ہٹاتا ہوں، نہ اس کے اسماء و صفات میں الحاد سے کام لیتا ہوں، نہ میں صفات الہی کی کوئی کیفیت بیان کرتا ہوں، نہ ان کو مخلوق کی صفات سے مشابہت دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی ہم نام نہیں، نہ ہی کوئی اس کا شریک ہے، نہ ہی اس کو اس کی مخلوق پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اور دوسروں کے بارے میں خوب جاننے والا ہے، وہ قول میں سب سے سچا اور بات میں سب سے اچھا ہے۔ اہل سنت والجماعت کے منافقین، یعنی اہل تکلیف و اہل تمثیل نے اس کے جو اوصاف بیان کیے ہیں، وہ ان سے منزہ ہے اور اہل تحریف و تعطیل نے اس کی صفات کا جو انکار کیا ہے، وہ اس سے بھی مبرا ہے، فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ☆ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ☆ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (المصافات: ۱۸۰/۳۷-۱۸۲) (تیرا عزت والا رب ان باتوں سے منزہ ہے، جو وہ بیان کرتے ہیں، رسولوں پر سلام ہو اور تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں، جو سب جہانوں کا رب ہے) چنانچہ فرقہ ناجیہ افعالِ باری تعالیٰ کے بارے میں قدریہ و جبریہ کے مذہب درمیان اعتدال پر ہیں، و عید الہی کے بارے میں وہ و عید یہ اور مرجیہ کے مذہب کے درمیان اعتدال پر ہیں، ایمان و دین کے بارے میں وہ حروریہ و معتزلیہ اور مرجیہ و جمہیہ کے مذہب کے درمیان اعتدال پر ہیں اور اصحابِ رسول ﷺ کے بارے میں وہ رافضیوں اور خارجیوں کے مذہب کے درمیان نقطہ اعتدال پر ہیں۔ میں یہ اعتقاد رکھتا ہوں کہ قرآن کریم کلامِ الہی ہے، اس کے طرف سے نازل شدہ ہے، مخلوق نہیں، یہ کلام اسی سے شروع ہوئی ہے اور اسی طرف لوٹ جائے گی، اللہ تعالیٰ نے حقیقتاً اس کی کلام کی ہے اور اسے اپنے بندے، رسول امین اور ہمارے پیارے نبی محمد ﷺ پر اپنے فرشتے کے ذریعے وحی کیا۔ میں یہ بھی ایمان رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے، ہر چیز اس کے ارادے کے ساتھ ہی ہوتی ہے، اس کی مشیت سے کوئی چیز خارج نہیں، نہ ہی کائنات کی کوئی چیز اس کے تقدیر سے باہر ہے، ہر کام اس کی تدبیر سے ہی صادر ہوتا ہے۔ کسی کے لیے مقررہ تقدیر سے فرار ممکن نہیں ہے اور جو کچھ لوح محفوظ میں لکھا گیا ہے، اس سے کوئی چیز تجاوز نہیں کر سکتی۔“

(مولفات الشیخ الامام محمد بن عبد الوہاب: ص ۸-۹) جاری ہے۔۔۔

حائضہ کو دی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے!

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

حائضہ کو دی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے، جیسا کہ نافع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مرہ، فلیراجعہا، ثم لیطلقہا طاهرًا أو حاملًا۔“ ”انہیں حکم دیں کہ وہ رجوع کر لیں، پھر طہریا حمل کی حالت میں طلاق دیں۔“ (صحیح بخاری: ۵۲۵۱، صحیح مسلم: ۱۴۷۱، واللفظ لہ)

فلیراجعہا کے الفاظ واضح طور پر وقوع طلاق کا پتا دے رہے ہیں، اگر طلاق واقع نہیں ہوئی تھی تو رجوع کیسا؟ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ پر یوں تبویب فرمائی ہے: ”اس بات کا بیان کہ جب حائضہ کو طلاق دی جائے تو وہ شمار ہوگی۔“ ہمارے موقف کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا اس طلاق کو شمار کیا جائے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہاں! (سنن الدارقطنی: ۵/۴، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۳۳۶/۷، وسندہ حسن) نیز سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ واقعہ بیان کیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک طلاق شمار کیا۔ (مسند الطیالسی: ۶۸، مسند عمر بن خطاب لابن النجاد: ۱، وسندہ صحیح) صاحب واقعہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما خود فرماتے ہیں: ”یہ میری ایک طلاق شمار کی گئی۔“ (صحیح بخاری: ۵۲۵۳) راوی حدیث عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ”سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اپنی بیوی کو حیض میں دی گئی طلاق ایک شمار ہو گئی تھی، اگرچہ ان کی یہ طلاق سنی نہ تھی۔“ (سنن الدارقطنی: ۶/۴، مسند عمر بن الخطاب، تحت حدیث: ۳، وسندہ حسن)

امام عطاء بن ابی رباح (مصنف ابن ابی شیبہ: ۵/۵، وسندہ صحیح)، امام زہری (ایضاً، وسندہ صحیح)، امام ابن سیرین (ایضاً، وسندہ صحیح)، امام جابر بن زید (ایضاً، وسندہ صحیح) اور تمام محدثین وائمہ دین رحمۃ اللہ علیہم حیض میں طلاق کو مؤثر سمجھتے تھے۔ اگرچہ حالت حیض میں طلاق سنی نہیں ہے، لیکن خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نافذ بھی کیا ہے، لہذا اس کے وقوع میں کوئی شبہ نہیں رہا۔ سنن ابی داؤد (۲۱۸۵) میں یہ الفاظ ہیں کہ: ”فردھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ولم یروھا شیئاً...“ ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لوندا یا اور آپ نے اسے (طلاق سنی) نہیں سمجھا۔“ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت حیض میں طلاق کو شمار کیا ہے، لیکن مستحسن خیال نہیں کیا۔

سنن الترمذی (۳۳۲۷، وسندہ صحیح) کے الفاظ ہیں: ”سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس (بیوی) کو واپس کر دیا (رجوع کا حکم دیا) حتیٰ کہ انہوں نے اسے حالت طہر میں طلاق دی۔“ مطلب یہ ہے کہ پہلی طلاق کے واقع ہوجانے کے بعد رجوع کیا، اس کے بعد حالت طہر میں دوسری طلاق دی، اس طرح تمام روایات میں تطبیق ہوجائے گی، کیونکہ صحیح حدیث اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اپنے بیان سے ثابت ہے کہ حالت حیض والی طلاق مؤثر ہوتی ہے۔

www.AhleSunnatPk.com